میں

الحمد لائبریری۔

فیس بک گروپ۔

کتابیں پڑھیے

تمام کتابیں بغیر کسی مالی فائدے کے عام قاری تک پی ڈی ایف میں پہنچائی جاتی ہیں
کتاب کے مواد سے ہمارا متفق ہونا لازمی نہیں
۔ فیس بک گروپ (کتابیں پڑھیے)
ایڈمنز (سید حسنین احسن ۔ زہرا علی
0314 595 1212
0344 818 3736

1۔ من کے نین ہزار (سید حسنین محسن)

2۔ سات دریاؤں کا پانی (دلاور علی آذر)

3۔ ایقان (نعیم رضا بھٹی)

من کے نین ہزار
سید حسنین محسن

تمام کتب بغیر کسی مالی فائدے کے پی ڈی ایف میں
تبدیل کی جاتی ہیں۔
کتابی مواد کی دمہ داری مصنف پر ہے۔

03448183736
03145951212

در بدر تھے پہ تیرے دل میں تھے
دل بدر ہو کے ہم کہاں جائیں؟
مجھ کو اک رات کی مہلت دے دے
تیرا غم تیرے مقابل لے آؤں
نہ ٹوٹ جائے کہیں سلسلہ توجہ کا
اک ایک پل کو ترا دھیان کر کے بیٹھے ہیں
یہ آئنے تجھے تصویر تیری کیا دیں گے
مری تھکی ہوئی آنکھوں میں خود کو دیکھ کبھی
ہجر کے دکھ کبھی وصال کے دُکھ
اُس نے بخشے مجھے کمال کے دُکھ

مَن کے نین ہزار

منفرد لہجے کے شاعر اور خوبصورت انسان
سیّد حسین احسن کے لیے
دعاؤں کے ساتھ

سیّد حسنین محسن

۱۵ مارچ ۲۰۱۶
منڈی بہاء الدین

الاشراق پبلشرز، لاہور

اشاعت اول	جنوری ۲۰۰۵ء
تزئین	حسن عسکری، ثقلین محسن
عکس گر	توقیر رضوی
سرورق	وسیم
کمپوزنگ	التمش، الاشراق کمپوزنگ سنٹر لاہور
اہتمامِ اشاعت	خالد علیم
پرنٹنگ	
قیمت	-/100 روپے

ناشر:

الاشراق پبلی کیشنز ۶۰-نور چیمبرز بنگالی گلی گنپت روڈ، لاہور

فون: 042-7353305

انتساب

ہم دونوں

کے

نام

من سے کوئی بات چھپے نا، من کے نین ہزار

(ساحرؔ لدھیانوی)

بکھرے پتوں کی، اُلجھے خوابوں کی
ایک ترتیب کس طرح سے ہو؟

۸۵

ہجر کے ڈاکیے کی پہلی ڈاک

تنہائی کے ہونٹوں پر آوارگی کا پہلا حرف عمر کے اُس حصے میں آیا جب عمر حصوں کی تقسیم سے واقف نہیں تھی۔ رتجگوں نے نیند کی پری سے میرے وجود کو چپکے سے چرالیا اور مجھے خبر بھی نہ ہوئی۔ رتجگوں کا تسلسل حیران پلکوں پر پہرہ دیتا رہا۔ اسی دوران آسمان والے چاند سے رابطہ ہوا۔ اس کی آوارگی سے اک سکون حاصل ہوا۔ زمین والے چاند سے ربط بعد میں ہوا مگر جب ہوا تو آنکھوں کے کھلے کواڑ اجنبی قدموں کے نشان ڈھونڈنے لگے۔ ہجر و وصال کے مقدس لمحات لوحِ دل پر نازل ہونے لگے' دل کے لب کھلتے رہے اور فرمائشیں، پوری ہوتی گئیں۔ بچپن' جوانی اور جوانی آوارگی کی نذر ہوگئی۔ یہی آوارگی فرصتوں کی دوست بنی اور فرصتیں میری۔

پھر ایک دن قلم نے انگلی پکڑ کر پہلا سخن لکھوایا۔ پہلا سخن جس کے نزول پر دل کا تاریک غار ''حرا'' میں تبدیل ہوگیا۔ اسی روشنی نے ایک دن سرِ راہ دو اجنبی آنکھوں سے ملوا دیا۔ ایک انجان شخص سے محبت کا پہلا اقرار بھی انجانے میں ہوا لیکن وعدوں کے جال میں یوں گرفتار ہوئے کہ رہائی نصیب نہ ہوئی (ہوتی بھی تو کون کافر رہا ہوتا)۔ وعدے کبھی پورے ہونے تھے نہ ہوئے لیکن چشمِ خیال نے اس کو آتے دیکھا' دل نے آگے بڑھ کر چراغ بجھا دیئے کہ وہ میری آنکھوں میں اپنی تصویر نہ دیکھ لے۔ وصال کے ان لمحوں میں بھی ہجر کے اندیشے سر اٹھا اٹھا کر دیکھتے رہے۔ ہر بات اس کی طرف سے تھی اور اسی کی چپ پر ختم ہو گئی۔ اظہار کا پل صراط پار نہ ہو سکا۔ اسی شام ہجر کا ڈاکیا پہلی ڈاک لے آیا۔ اُدھ کھلے

دروازے کی اوٹ سے دو آنکھیں نظر آئیں اور ان آنکھوں میں' آدھا راستہ طے کیے ہوئے دو آنسو' دروازے کی چوکھٹ پر سر کو ٹکتے ہوئے اور ایک آنسو گرتے ہوئے دیکھا' دوسرا کب گرا' معلوم نہیں۔ اتنا یاد ہے کہ ''الوداع'' کے لفظ نے دامن کو ایک جھٹکا دیا لیکن بھیگے دامن کے جھٹکے سے بھی آنسو ہی گرے۔

میں نے کھلے دروازے پر ڈوبتی آنکھوں سے ہجر کا استقبال کیا کیونکہ یہی ہجر تو اس کی آخری نشانی ہے۔ مہینے سالوں میں تبدیل ہوتے رہے اور سال صدیوں میں۔ ہر دسمبر سرد آگ برساتا رہا' وہ دسمبر جو الہامی سال کے کیلنڈر کا پہلا مہینہ ہے۔ سفر ساتھ ساتھ چلتا رہا آخر تھک کر پیڑ کے سایے میں جا بیٹھا۔ جلتے درختوں کی ٹھنڈی چھاؤں میں بیٹھے ہوئے معلوم نہ تھا کہ کبھی خود بھی جلنا پڑے گا۔ زادِ راہ اشکوں اور آبلوں کے سوا کیا تھا۔ آبلے تو کم ظرف نکلے مگر اشکوں کا ذائقہ ہمیشہ ایک سا رہا۔

اس کے جانے کے بعد نیلے آسمان تلے پیلی سرسوں کبھی نہ پھولی' رنگوں سے باتیں کرنے کی کوشش کی تو اپنا رنگ بھی مدھم پڑ گیا۔ اپنے محسن' سید محسن نقوی کی طرح خوابوں سے پیار کیا اور خوابوں کا قرض سود سمیت واپس کرتا رہا۔ خوابوں نے خاموشی عطا کر دی لیکن اس خاموشی نے سماعت پر ایسے وار کیے کہ بعض اوقات دل نے چاہا کہ دھڑکنا چھوڑ دے مگر دل پر بھی اپنا اختیار کب ہے۔

خواب سے تعبیر تک کا سفر' سفر ہی رہا۔ ہاتھ کی ہتھیلیوں پر لکیریں بدلتی رہیں لیکن دل کا موسم نہ بدلا۔ کبھی حرفوں کی بارش ہوتی تو سوچ کے صحن میں دو چار پھول کھل اُٹھتے۔ وقت گزرتا رہا پھر ایک شب ''انا'' سے ملاقات ہوگئی۔ اس کے ہاتھ میں ضد اور مان کی لاٹھیاں دکھائی دیں۔ ''انا'' کے ہاتھوں شکست کھا کر کبھی دُکھ نہ ہوا۔ اسی انا سے تو میرے لفظ رزق لیتے ہیں۔

ہر موڑ پر دوستوں کی نفرت کا شکریہ ادا کیا۔ یہی نفرت تو مجھے روز مجھ سے ملا دیتی ہے۔ اپنی جھولی میں ہمیشہ پتھر اکٹھے کیے تاکہ دوستوں کو مجھ پر سنگ باری کے لیے بھی پتھر اکٹھے کرنے کی تکلیف نہ اٹھانا پڑے۔

پھر اُس سے ملاقات ہوئی جس نے کہا میں نے ایک بکھرے ہوئے شخص کو اپنا سہارا کیسے سمجھ لیا۔ غلط جگہ پر محبت اور نفرت کرنے والی وہ لڑکی اپنے خوابوں سے کتنا پیار کرتی تھی وہ جو کہتی تھی میں حیران ہوں تمہیں کیسے لوگ ملے ہیں، تمہیں تو پیار کرنا بھی نہیں آتا' لوگ نہ جانے کیا کچھ کہتے ہیں۔ یاد رکھنا پیار ٹھہری ہوئی آگ ہے۔ یہ سلسلہ نیا تھا مگر انجام وہی پرانا۔ بے وفائی پر پہلی بار شرمندگی ہوئی' بعد میں نہیں لیکن بے وفائی کے اقرار نے اَنا کے بت کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ اپنے مجرم خود بنے اور خود ہی سزا بھی تجویز کی۔ سوچ کے زندان میں رتجگوں کی عمر قید۔ یہ عمر قید کاٹنے ہی سے کٹے گی۔

اگر آپ کو بھی کسی سے پیار ہے' آپ بھی بے وفا ہیں تو آئیں' اکٹھے جاگتے ہیں اور قید کاٹتے ہیں۔

سید حسنین محسن

دسمبر ۲۰۰۴ء

لاہور

اگر کبھی میری یاد آئے

0333 4777000

0300 8478450

جیون میں بَس اِتنا سُکھ ہے
جتنا تیرا آنچل سَر کے

⦿

تشنگی کے عجب مقدر ہیں
کتنے چھالے مری زباں پر ہیں

جس کی چوکھٹ سے پھوٹتی ہے شفا
ہم اُسی پاک گھر کے نوکر ہیں

وقت جن کا طواف کرتا ہے
نوکِ نیزہ پہ ایسے بھی سَر ہیں

⦿

منظر کچھ اس طرح تھا ترے "الوداع" کا
میں دیر تک کھلا ہوا در دیکھتا رہا

پانی کی ایک بوند تھی پلکوں پہ رُک گئی
ہونٹوں پہ ایک نام تھا آ کر ٹھہر گیا

آنکھیں اُسے بلانے بہت دُور تک گئیں
اُس نے مرے وجود کو تقسیم کر دیا

آنسو بتا رہے تھے کہ وہ بھی مرے لیے
رُکنا تو چاہتا تھا مگر رُک نہیں سکا

⦿

سوال ہونے سے پہلے سوال جانتا ہے
کوئی تو ہے جو سخن کے کمال جانتا ہے

کھلے گی دل پہ حقیقت تو جانے کیا ہوگا
ابھی تو تجھ سے مراسم بحال جانتا ہے

میں ہار جاؤں مگر جیت لوں تمہیں تم سے
اے میرے دوست! کوئی ایسی چال جانتا ہے

گنوا کے مجھ کو ادھورا رہے گا ساری عمر
عذابِ ہجر کا کیا ہے مآل جانتا ہے

مری غزل کے ہیں یہ خال و خد کہ اُس کا بدن
یہ بات "صاحبِ حسن و جمال" جانتا ہے

وہ میرا ایک بھی سُر کب بگڑنے دیتا ہے
مرے وجود کی جو اصل تال جانتا ہے

⊙

وہیں کھڑا ہوں میں اب تک جہاں کہ پہلے تھا
تمہاری سمت سفر کا ارادہ کر کے بھی

⦿

چاہت کے موسموں میں کدورت عجیب ہے
میرے سخن شناس کی عادت عجیب ہے

کانٹوں سے مانگتا ہے وہ ذوقِ نمو کی بھیک
فصلِ خزاں میں پھول کی قسمت عجیب ہے

پیروں میں روندتا ہے بھرم کے گلاب کو
اُس شخص کا طریقِ محبت عجیب ہے

وہ میرے خواب بانٹ رہا ہے گلی گلی
دیکھو مرے سخی کی سخاوت عجیب ہے

پگھلا رہا ہے برف مرے سائبان کی
سورج کی میرے ساتھ عداوت عجیب ہے

⊙

کسی نے پوچھا جو مدّت کے بعد حال ترا
گماں کو اذنِ سفر دے گیا خیال ترا

تجھے بھلائے بھی مدّت گزر گئی لیکن
پڑا ہے دستِ طلب میں وہی سوال ترا

یہ تیرا عکس ہے اور تجھ سے خوبصورت ہے
مری غزل کی طرح تو نہیں جمال ترا

میں کیسے تجھ کو بتاؤں اے میرے کوزہ گر
مرے وجود کی تخلیق ہے کمال ترا

یہ ایک سوچ مراسم بڑھائے رکھتی ہے
مرے بغیر سنبھلنا بھی ہے محال ترا

⦿

مرے ساتھ تو بھی ہے دربدر' یونہی ضد نہ کر
تجھے کیا ملا مجھے چھوڑ کر' یونہی ضد نہ کر

مرا دل ہے تیری امان میں' ترے دھیان میں
کبھی دیکھ اپنا اداس گھر' یونہی ضد نہ کر

مرے دیپ کوئی بجھا نہ دے' تو ہوا نہ دے
کوئی چھین لے نہ مرا ہنر' یونہی ضد نہ کر

میں ترے ہی فن کا کمال ہوں کہ خیال ہوں
مجھے نام دے مرے کوزہ گر' یونہی ضد نہ کر

ترے ساتھ روح کا میل ہے، کوئی کھیل ہے؟
نہ اُجاڑ، میرا بسا نگر، یونہی ضد نہ کر

تو چلا ہے زخم کریدنے، اُسے دیکھنے
مرے نامہ بر، مرے ہم سفر، یونہی ضد نہ کر

⦿

وہ مجھ کو چھوڑ گیا لوٹ کر نہیں آیا
جوازِ ترکِ تعلق نظر نہیں آیا

مری منڈیر پہ بیٹھے ہوئے پرندے نے
بڑے سکون سے پوچھا "وہ گھر نہیں آیا"!

تمام شہر کے خدشات پھر غلط نکلے
وہ مجھ کو دیکھنے پھر بام پر نہیں آیا

سجایا میں نے ہتھیلی پہ نقشِ پا تیرا
مگر عجیب کہ ذوقِ سفر نہیں آیا

◉

ہجر کے دُکھ کبھی وصال کے دُکھ
اس نے بخشے مجھے کمال کے دُکھ

آئنے کی جبیں پہ دیکھے ہیں
رقص کرتے ترے جمال کے دُکھ

اِک قیامت تھی جس کو حرفِ طلب
اُس کو سہنے پڑے سوال کے دُکھ

اپنی حدِّ کمال تک پہنچے
زندگی میں کئی زوال کے دُکھ

اُس کو کیا قدر ہے فضاؤں کی
جس نے دیکھے نہیں ہیں جال کے دُکھ

⊙

ترے غم کی حمایت کر رہی ہیں
کہ اب سوچیں بغاوت کر رہی ہیں

وہ جس موسم میں لوٹ آتی تھیں کونجیں
اب اُس موسم میں ہجرت کر رہی ہیں

ابھی تک دل کی اجڑی سلطنت پر
تری یادیں حکومت کر رہی ہیں

بھرم

بھرم مت ٹوٹنے دینا
بھرم ٹوٹے تو لمحوں میں یہ گھر برباد ہوتے ہیں
یقیں کی ڈالیوں پر جھولتے یہ آشیانے بھی
فلک پر پھیلے رنگوں کا لبادہ چاہتے ہیں
یقیں مت ٹوٹنے دینا
کہ ''ہم جیسے بھی ہیں'' لیکن
یقیں کو اپنے خوابوں سے زیادہ چاہتے ہیں

پانی

یہ پانی بھی عجب شے ہے
کبھی بے وجہ اک چھوٹے سے قطرے کی طرح
آنکھوں سے گرتا ہے
کبھی گالوں پہ رُک کر جھلملاتا ہے
کبھی ویراں لکیروں کی ہتھیلی میں کہیں رستہ بناتا ہے

یہ پانی ہے
جو پیاسی خشک دھرتی کے لیے ایسے ضروری ہے

کہ جیسے

ہجر کے مارے ہوئے دل کے لیے ملنے کا وعدہ ہو

یہ پانی ہے

جو دل کی آگ پی کر اجنبی پلکوں پہ رُکتا ہے

اُس اِک پل کو ترستا ہے

کہ جب حیران پلکیں

ایک دوجے کے گلے میں اپنی باہیں ڈال کر روئیں

لفظ پھر بھی معتبر ہیں

سوچ کے محبس میں ہوں یا وقت کے زندان میں
لفظ پھر بھی معتبر ہیں
''یاد'' بھی اک لفظ ہے
جو کسی کی رات دن میں جاگتی آنکھوں میں سپنے بانٹتا ہے
''ہجر'' بھی اک لفظ ہے
جو بے سکوں آنکھوں سے دل تک راستے سنسان کر کے پوچھتا ہے
جی رہے ہو؟

''پیاس'' بھی اک لفظ ہے
کانپتے سوکھے ہوئے ہونٹوں کو ایسی تشنگی کا ذوق دیتا ہے
جو مٹتی ہی نہیں

''دھوپ'' بھی اک لفظ ہے
جسم کے ہر انگ کو جھلسا کے دامن میں اداسی باندھتا ہے
''دشت'' بھی اِک لفظ ہے

پاؤں کو اُن دور تک پھیلی ہوئی ویرانیوں میں بھیجتا ہے
جن کی کوئی حد نہیں

''خامشی'' بھی، ''بے بسی'' بھی، ''اجنبی'' بھی لفظ ہیں
''ریت'' بھی، ''جیون'' بھی، ''دھرتی'' بھی، ''صبا'' بھی لفظ ہیں
کچھ بھی ہوں جیسے بھی ہوں
یہ لفظ پھر بھی معتبر ہیں
سوچ کے محبس میں ہوں یا وقت کے زندان میں

دوستوں کے لیے ایک نظم

فصیلِ شہرِ تمنا پہ دیکھ سنگ بدست
کھڑے ہیں دوست مرے، زندگی سے پیارے دوست
عدو کے دل میں عجب خوف ہے کہ یہ سارے
مری شکستہ صفوں کو بچانے آئے ہیں
مگر یہ شہرِ تمنا ہے اور میں جانتا ہوں
فصیلِ شہرِ تمنا پہ میرے پیارے دوست
ہیں منتظر کہ مری آنکھ پر اندھیرا گرے
اِدھر اندھیرا گرے اور اُدھر وہ بارشِ سنگ
مرے وجود کے شیشے کو چور چور کرے
''میں جانتا ہوں'' مگر دل کی ایک خوش فہمی
دکھا رہی ہے وہ دیکھو تری حفاظت کو
''کھڑے ہیں دوست ترے، زندگی سے پیارے دوست''

محبت بھی عجب اک مسئلہ ہے

قبائل کے سبھی سردار چپ ہیں
سبھی مغرور سَر سہمے ہوئے ہیں
چمکتے زرنگاریں دست و پا پر
شکستِ ذات کی مہریں لگی ہیں
تصنع سے بھری رسموں کی چادر
کسی کی جیت پر پردہ کیے ہے
رواجوں کی سیہ پوشاک پہنے
روایت کا نمائندہ کھڑا ہے
حکومت کا نشہ اُترا ہوا ہے

⦿

ساعتِ جاں میں ہجر کا لمحہ کتنا غیر ضروری ہے، مجبوری ہے
اِس موسم میں تیرے شہر میں رہ کر تجھ سے دُوری ہے، مجبوری ہے

ساری باتیں دُنیا جہاں کی تجھ سے کی ہیں آج تلک پر میری جاں
ایک جو بات تمہیں کہنی تھی وہ اِک بات ادھوری ہے، مجبوری ہے

دروازے پر آنکھیں رکھ کر تم نے سمجھا وقت کٹے گا یہ تو سوچو
وصل کا دن تو دو پل کا تھا ہجر کی رات تو پوری ہے، مجبوری ہے

⦿

تمہارا ہجر سہنا پڑ گیا تو
اس اُجڑے گھر میں رہنا پڑ گیا تو
جسے "انکار" کہتا ہے زمانہ
مجھے وہ لفظ کہنا پڑ گیا تو

⦿

تمہارے ہجر کے موسم میں دو ہی کام ہوئے
کہ ہم کسی کے ہوئے، تم کسی کے نام ہوئے

ترے سکوت کے لمحے نے جب قیام کیا
تو گفتگو کے سبھی سلسلے تمام ہوئے

بغیر جن کے نہ کٹتا تھا ایک پل بھی کبھی
زمانے بیت گئے اُن سے ہم کلام ہوئے

اُسے کہو کہ وہ ضد چھوڑ دے، پلٹ آئے
ہوئی ہے دیر بہت آنکھوں میں شام ہوئے

اُدھر چراغ جلے اور اِدھر سرِ محفل
حیا سے کانپتی پلکوں سے کچھ سلام ہوئے

تمہارے بخشے ہوئے دُکھ کہاں چھلکتے ہیں
کہ زخم زخم ہوئے اور جام جام ہوئے

⦿

خوش تھے ہم اس وبال سے پہلے
ہجر کے ماہ و سال سے پہلے
ہم کو اپنا خیال بھی کب تھا
ایک تیرے خیال سے پہلے

⦿

ہے زرد رُت میں محیطِ حواس خاموشی
کہ میری ذات کو آئی ہے راس خاموشی

کسی نے ہجر کے پہلے عذاب کی صورت
اُتاری لمحہ بہ لمحہ اُداس خاموشی

ازل سے حشر بپا ہے مری سماعت میں
کہاں ہے تشنہ خیالوں کی پیاس خاموشی

حسیں نگاہ سے اقرار کا حسیں لمحہ
وہ شام، لوٹتے پنچھی، وہ گھاس، خاموشی

بدن بدن سے ملے تو سخن کی حاجت کیا
ترے وصال کے پھولوں کی باس خاموشی

مرے سکوت کو تیری عطا کی عادت ہے
سو تیرے لب سے سخاوت کی آس خاموشی

⊙

آؤ اک عمر کی جدائی کو
وصل کے ایک پل سے تولتے ہیں

⦿

لکھا ہے شاخِ بدن پر سوال پت جھڑ کا
ہمیں جو دیکھے وہ دیکھے جمال پت جھڑ کا

بہار چہروں پہ پھیلی ہوئی ہے ویرانی
ہماری آنکھ سے دیکھو کمال پت جھڑ کا

درخت زرد ہوئے ہیں کسی کے آنگن کے
ہُوا ہے پھر سے تعلق بحال پت جھڑ کا

وہ خشک پتے بچھا کر ہماری راہوں میں
چھڑک رہا ہے فضا میں ملال پت جھڑ کا

ترے بغیر جو گزرا وہ وقت ایسے تھا
ہری رتوں میں ہو جیسے خیال پت جھڑ کا

⊙

(محسن نقوی کی نذر)

میری طرح کی ایک تو عادت اُسے بھی تھی
کم ظرف دشمنوں سے عداوت اُسے بھی تھی

گُم صُم کھڑا تھا میں بھی سخاوت کے باوجود
وہ ساعتِ سوال قیامت اُسے بھی تھی

میں تھا کہ جس نے بزم میں اقرار کر لیا
وہ مانتا نہیں تھا محبت اُسے بھی تھی

میں بھی کشید کرتا تھا لفظوں سے تلخیاں
غزلوں میں ایک درد کی حاجت اُسے بھی تھی

کچھ دیر کے لیے مری آنکھیں وہ لے گیا
چاہت بھری نظر کی ضرورت اُسے بھی تھی

ع ذکرِ شبِ فراق سے وحشت اُسے بھی تھی (محسن نقوی)

⊙

(حیدر گیلانی کی محبت کی نذر)

ہوا کے جبر کا منظر مری نظر میں ہے
کہ پنچھیوں کا بسیرا بُرے شجر میں ہے

وہ خود کو سوچ رہا ہے مرے حوالے سے
یہ معجزہ بھی محبت کے اِس سفر میں ہے

جو تشنہ لب نہیں رہتے اُنہیں نصیب کہاں
وہ ذائقہ جو مری پیاس کے اثر میں ہے

نگاہ اپنے خدوخال سے گریزاں ہے
یہ کیسا آئنہ اب کے مری نظر میں ہے

ہوا نے ایسے تراشے ہیں نقش صحرا میں
کہ حُسنِ موجِ رواں ریت کے بھنور میں ہے

اُدھورے خواب' لٹی سوچ' غم زدہ سایے
تمہارے بعد یہی کچھ اُداس گھر میں ہے

کچھ اِس وقار سے اُٹھا وہ سَر' سرِ مقتل
کہ اب بھی خوفِ سناں شمر کے جگر میں ہے

گل ملال کی مہکار بام و در میں ہے
اَزَل سے ایک اُداسی ہمارے گھر میں ہے
(حیدر گیلانی)

شیرازہ

اُس نے اک لفظ ''الوداع'' کہا
اور چپ لگ گئی درختوں کو

⦿

دربدر تھے پہ تیرے دل میں تھے
دل بدر ہو کے ہم کہاں جائیں؟

⦿

ہوتا نہیں اک پل بھی الگ ذات سے میری
یہ ہجر مرا' تیری سہیلی کی طرح ہے

⦿

فیصلہ کرنے میں پھر دیر بھلا کیا لگتی
مسئلہ پیار کا تھا اور انا پر ٹھہرا

⦿

ہر گھڑی اس کو سوچتا ہوں میں
جو کبھی میرے روبرو بھی نہیں
مجھ کو جس کی تلاش ہے اب تک
دکھ تو یہ ہے وہ شخص تو بھی نہیں

⦿

کس کس کے سوالوں کی وضاحت میں اُلجھتا
اچھا ہے کہ رُسوائی کے موسم میں ملے ہو

⦿

اپنے دل کا موسم جلتی دھوپ کے موسم جیسا ہے
اسی لیے میں دوپہروں میں تنہا پھرتا رہتا ہوں

⦿

منسوب تھے جو مجھ سے وہ ہالے کمال تھے
اُس شخص کے بھی چاہنے والے کمال تھے

آنکھوں میں ایک بار بسائی تھی تیرگی
پھر دل کو جو ملے تھے اُجالے کمال تھے

اے ہجرِ با مراد! ہمیں اعتراف ہے
تو نے بھی اہلِ درد سنبھالے کمال تھے

دادِ ہنر کے شوق میں ہم کھا گئے فریب
اُس غار پر لگے ہوئے جالے کمال تھے

کیسے میں اپنی ٹوٹتی سانسوں پہ سوچتا
پیوست مرے جسم میں بھالے کمال تھے

⦿

مانا مرے وجود کو تقسیم کر گیا
یہ بھی بہت کہ ہجر کا موسم سنور گیا

تیرے بغیر زیست ادھوری نہیں مگر
لمحہ خوشی کا دیکھے زمانہ گزر گیا

آنکھوں کا ساتھ چھوڑ گئی نیند کی پری
دل میں کسی کی یاد کا موسم ٹھہر گیا

اب بھی رواں نہ ہوسکیں وعدوں کی کشتیاں
اب کے بھی ہم کو دیکھ کے دریا اُتر گیا

جانے لگا وہ شخص تو ایسا لگا مجھے
جیسے کہ میرے ہاتھ سے میرا ہنر گیا

اوری اینٹل کی شہزادی

وہ آ رہی ہے حسیں موسموں کے جھرمٹ میں
مثالِ موجِ صبا، ایک اجنبی کی طرح
خیالِ رنگِ سحر آفتاب کی صورت
دیارِ سبز میں اک ان کھلی کلی کی طرح

وہ جس کے نام سے رنگوں کا عکس ڈھلتا ہے
جمودِ ذہن سے ہٹتے ہیں یاس کے سائے
دیارِ تیرہ شبی میں اُبھرنے لگتے ہیں
کسی خیال کے دیپک تو آس کے سائے

چلے تو ساتھ چلیں کوہِ قاف کی پریاں
رُکے تو موسمِ گل کا قیام ہو جائے
جو بیٹھ جائے کسی پیڑ کی اُداسی میں
تو لوٹ آئیں پرندے کہ شام ہو جائے

کرے جو بات تو لطفِ سخن مکمل ہو
ہنسے تو خشک فضاؤں میں کہکشاں بکھرے
کبھی جو آنکھ میں آ جائے بھول کر آنسو
تصوّرِ غمِ ہجراں سے سب سماں بکھرے

جو اُس کی زلف کی کالی رُتوں میں گھر جائے
اُسے تلاشِ رہِ جستجو نہیں رہتی
وہ جس پہ دھوپ میں چھا جائے ابر کی چادر
کسی بھی شے کی اُسے آرزو نہیں رہتی

جو اُس کی آنکھ میں دیکھے تھمی رُتوں کا طلسم
گماں کے شہر میں ہو جائے سنگ کی صورت
ہجومِ لالہ رُخاں میں، مَیں اُس کو دیکھتا ہوں
سبھی سے دُور کھڑے اک ملنگ کی صورت

وہ اُس کے پاؤں میں پازیب کی چھنا چھن چھن
سُروں کی تال پہ تازہ کوئی غزل لکھوں
حسیں جمال کو لکھوں مثالِ برگِ گلاب
کھلے بدن کو کسی جھیل کا کنول لکھوں

وہ جس کا نام سماعت میں شہد گھولتا ہے
وہ جس کو پیار سے کہتے ہیں لوگ شہزادی
مری دعا ہے کہ اِس شہرِ بے مروّت میں
لگے نہ ''تجھ'' کو کہیں کوئی روگ شہزادی

خود کو کب تک دھوکا دو گے؟

یا تو اپنی آنکھوں کی دہلیز پہ بکھرے آنسو روکو
ہونٹوں پر مسکان سجاؤ
یا پھر دل کے آئینے میں جو تصویر اُبھرتی ہے
اُس سے میرے نقش ملاؤ
مان بھی جاؤ

مجھے رسائی دے

شفق سے آج چرا کر سکون کے لمحے
گماں کی زرد قبا پر تمہارا نقش بنوں
فرازِ حرفِ جنوں سے سمیٹ کر یادیں
ترے تھکن بھرے لہجے میں اپنا نام سنوں
ہر ایک گام تیرا عکس ہی دکھائی دے

یقیں کی لَو پہ تراشوں میں خال و خد تیرے
ادائے وقت پہ بکھراؤں کالی زلفوں کو
سیاہ رات کے چہرے پہ آ کے ہولے سے
مزا تو جب ہے کہ رکھ دوں میں تیری آنکھوں کو
یہیں سکوتِ تمنا میں تو سنائی دے

نظر کو اپنے تبسم کی اِک جھلک دے دے

بغیر اِس کے مری داستاں ادھوری ہے

لبوں پہ رقص کناں جب نہ ہو سخن تیرا

وسیلہء درِ خوشبو سے کتنی دوری ہے

چلا ہوں ڈھونڈنے خود کو، مجھے رسائی دے

مجھے تم سے محبت ہے

''مُجھے تم سے محبت ہے''
یہ جملہ کتنی صدیوں سے پرانا ہے
مگر جب سر جھکا کر کانپتے ہونٹوں سے
اس نے یہ کہا مجھ سے
''مجھے تم سے محبت ہے''
تو مجھ کو یوں لگا جیسے
کہ اِس جملے کے سارے لفظ ہی آنکھوں سے مخفی ہیں
کہ اِن لفظوں کے سارے حرف بھی کچھ اجنبی سے ہیں
یہ جملہ جتنی صدیوں سے پرانا ہے
مگر چاہت کے رنگوں سے سجا ہے
کوئی رُت ہو یہ ہر رُت میں ہرا ہے
یہ جملہ آج بھی بالکل نیا ہے

⊙

ذکر تلاشِ سایہء جاں اور کیا کریں
توراتِ ہجر کی ہوئیں آیات گرد گرد

ٹھہرا ہو جیسے شاخِ دسمبر پہ کوئی پھول
اب کے ملا تو مجھ کو لگا کتنا زرد زرد

حیرت ہے تیرے ہجر کے بس ایک گھاؤ سے
آتش مزاج شخص کا لہجہ ہے سرد سرد

⦿

ہوا کے سامنے ٹھہرا دیا مگر کچھ دیر
سیاہ شب میں اُجالا رہا مگر کچھ دیر

کسی کو کیسے بتاؤں کہ کیوں میں تنہا ہوں
کہ تیرا ساتھ بھی مجھ کو ملا مگر کچھ دیر

ہماری جاگتی آنکھوں کا قرض بھول گیا
فلک پہ آج ستارہ رُکا مگر کچھ دیر

کسی کے کہنے پہ چپکے سے چاند نے آ کر
ہٹائی سینۂ شب سے ردا مگر کچھ دیر

بس ایک پل ہی وہ معجزنما رہا چھت پر
فصیلِ دل پہ کوئی گُل کھلا مگر کچھ دیر

حریمِ ذات سے باہر شعور بھٹکا رہا
میں اپنے آپ سے شاید ملا مگر کچھ دیر

بجا کہ پہلے سی وہ کیفیت نہیں اب کے
مرے لبوں پہ رہی اک دعا مگر کچھ دیر

نظر سے جیسے ترے خال و خد بچھڑ جائیں
یہ سانحہ بھی مری جاں ہوا مگر کچھ دیر

⊙

فلک پر اپنی قسمت کا ستارہ ٹوٹنے کو ہے
تعلق روشنی سے اب دوبارہ ٹوٹنے کو ہے

تری پلکوں پہ ٹھہرے آنسوؤں سے ایسا لگتا ہے
کہ بحرِ درد کا کوئی کنارا ٹوٹنے کو ہے

''تجھے میرا مجھے تیرا سہارا'' جو میسر تھا
ستم یہ ہے کہ اب وہ بھی سہارا ٹوٹنے کو ہے

یہاں تو تیرے ہاتھوں نے چھڑایا ہے مرا دامن
اِس اگلے موڑ پر وعدہ ہمارا ٹوٹنے کو ہے

تری آنکھوں نے مجھ سے آج کیسا جھوٹ بولا ہے
یقیں کا جو حسیں پیکر تھا سارا ٹوٹنے کو ہے

۱- ''تجھے میرا مجھے تیرا سہارا' مگر دونوں عصا ٹوٹے ہوئے ہیں (حوالہ نظم ''پسپائی'' حیدر گیلانی)

⦿

بیتے دِنوں کی یاد کو لفظوں میں ڈھال کر
رکھے ہوئے ہیں مَیں نے ترے خط سنبھال کر

وابستہ تجھ سے ہیں مری سانسوں کے قافلے
مجھ کو بھی دیکھ اور کچھ اپنا خیال کر

ترکِ تعلقات جو ضد ہے تو پھر نبھا
لوگوں کے ڈر سے یوں نہ مراسم بحال کر

اُجڑے ہوئے محل میں ہیں مدفون سیم و زر
کاسہ مرا نہ دیکھ تو مجھ سے سوال کر

یا مجھ سے چھین لے یہ متاعِ سخن ابھی
یا بزمِ فکر و فن میں مجھے بے مثال کر

⦿

آج بھیجا ہے چاند نے یہ پیام
آؤ مل کر گزارتے ہیں شام

عقل بیٹھی ہے آ کے منبر پر
پھر جنوں پر لگا کوئی الزام

چھوڑ ترکِ تعلقات کی ضد
دیکھ موسم نے کیا دیا پیغام

اپنی پہچان چھن رہی ہے کیا
بھولتا جا رہا ہے آپ کا نام

منزلِ عشق راستوں میں رہی
ہے سفر، در سفر، سفر انجام

اُس نے آنکھوں پہ ہاتھ رکھ کے کہا
جایئے، کیجیے جہان کے کام

⊙

وہ جس کا پہلا تعارف ہی میری ذات سے ہے
وہ شخص مجھ کو کوئی نام دینا چاہتا ہے

⦿

جانے کیوں کم آرزوئے تشنگی ہے
پیاس کا تو ذائقہ اب بھی وہی ہے

خون چمکا سینۂ افلاک پر یوں
چاروں جانب روشنی ہی روشنی ہے

یوں دیے سے آ کے ملتی ہے ہوا بھی
جیسے دونوں میں پرانی دوستی ہے

سوچ کر کرنا کوئی بھی فیصلہ تم
تاش کی بازی نہیں، یہ زندگی ہے

منقسم ہونے لگے ہیں جان اور دل
ایسا لگتا ہے جدائی کی گھڑی ہے

⦿

مانا اشک بہانا بھی سمجھوتہ ہے
لیکن اسی بہانے اُس کو یاد کرو
ہجر کے شہزادے نے دل سے آج کہا
ان آنکھوں کا بنجر پن آباد کرو

⊙

دشت انا کی دُھوپ جلاتی رہی بدن
ہم لوگ کر رہے تھے سفر اس کے باوجود

ہر سمت بانٹتی ہیں ہوائیں نمو کا رَس
سوکھے ہوئے ہیں کتنے شجر اس کے باوجود

وہ شخص دیکھنے میں زیادہ حسیں نہیں
ہٹتی نہیں ہے اُس سے نظر اس کے باوجود

یہ جانتے ہوئے یہاں لہریں بھی آئیں گی
اُس نے بنایا ریت پہ گھر اس کے باوجود

ہم نے سیاہ رات میں خود کو جلا دیا
بخشش میں مل سکی نہ سحر اس کے باوجود

لشکر ہے اور کانپ رہا ہے سنان سے
مقتل کا خوف، جبر کا ڈر اس کے باوجود

لکھ کر کسی کے نام جلاتا ہوں چٹھیاں
اور منتظر ہوں آئے خبر اس کے باوجود

چھا جائے میرے دل پہ اُداسی کی زرد شام
تو روز مسکرا، تو سنور اس کے باوجود

⊙

بسنت رنگ میں رنگی ہوئی پتنگ کی طرح
نظر کو راس آ گیا وہ شوخ، رنگ کی طرح

ہیں خال و خد وہی مگر میں کھوکھلا سا ہو گیا
کہ تیرا ہجر کھا گیا مجھے بھی زنگ کی طرح

یہ ہار جیت کچھ نہیں ہمیں فقط خبر ہے یہ
کہ درد چھوڑتا نہیں انا کی جنگ کی طرح

گلے پڑے گا اور بھی، نہ آپ اس کو چھیڑیے
کہ عشق کا مزاج بھی ہے اِک ملنگ کی طرح

⊙

اُس کی آنکھیں دیکھ کے کوئی اپنے ہوش گنوا بیٹھا
خود کو پاگل لکھنے والی لڑکی کو معلوم نہیں

یہ بھی بہت ہے ہم نے بازی ایک بساط پہ کھیلی ہے
تم سے ہار کے جیت گئے ہیں دل اپنا مغموم نہیں

کچھ نہ بول مسیحا تیری کون گواہی مانے گا
حرص و طمع کی اس دنیا میں مریم بھی معصوم نہیں

رفعتِ خیال

سیہ لباس میں ملبوس ایک شہزادی
حسیں بدن کے خدّوخال جب چھپاتی ہے
مرے حروف تخیل میں رقص کرتے ہیں
غزل خیال کے لہجے میں گنگناتی ہے

وہ اُس کا جسم کہ جیسے کوئی صراحی ہو
وہ اس کے نقش کہ حیراں کھڑا ہو کوزہ گر
وہ لوچ ایسی کہ تارِ کماں بھی دنگ رہے
تراش ایسی کہ ہو جائے سرد دستِ ہنر

کٹاؤ ایسا کہ ہر خال و خد پکار اٹھے
بدن کے خم ہیں کہ جیسے ہنر تراش کا فن
ہر اک نشیب حسیں ہے ہر اک فراز حسیں
کہ جس طرح ہو جواں میرؔ کی غزل کا بدن

وہ اُس کا جسم کہ جیسے چھلکتا جامِ شراب
کہ انگ انگ سے پھوٹے نشہ جوانی کا
کہ جیسے ایک کلاسیکی فلم کا کوئی سین
کہ جیسے موڑ محبت کی اِک کہانی کا

کھلے جو زُلف تو بکھرے جہاں میں ہجر کا رنگ
سنوار لے تو مقدر مرا سنور جائے
پھریں جو انگلیاں بالوں میں ایک جھٹکے سے
جمالِ رنگ حنا سے سحر نکھر جائے

وہ ایک لٹ جو مسلسل اُسے ستاتی ہے
ذرا سی دیر جو اُس کی جبین پر ٹھہرے
وطن سے دُور کہیں رات کا مسافر بھی
کرے دُعا کہ سرائے میں عمر بھر ٹھہرے

پلک اٹھائے تو ساکن ہو کاروبارِ حیات
دیارِ مہر و وفا میں سکوت ہو جائے
وہ آنکھ بھر کے کسی شخص کو اگر دیکھے
مجھے یقیں ہے کہ وہ راستے میں کھو جائے

وہ جس کی آنکھ میں پوشیدہ اک کرن کے لیے
تمام رات بھٹکتے ہیں راہ میں جگنو
وہ جس کے ریشمی ملبوس میں سمانے کو
اُداس رہتی ہے گلشن میں رات دن خوشبو

"وہ ہونٹ ہونٹوں پہ رکھنے کا اِذن جو دے دے"
ازل سے پیاسا بدن فیض یاب ہو جائے
وہ دونوں ہونٹ ملا کر جو ایک دم چھوڑے
تو سنگ ریزہ بھی جھٹ سے گلاب ہو جائے

وہ اُس کے ہونٹ جسے چاہے زندگی دے دیں
بریدہ شاخ بھی چومیں شگوفہ کھل جائے
کلام کرنے پہ آئیں تو ساتھ دیں پنچھی
جو چپ رہیں تو ہوا کی زبان سل جائے

قلم سے ایسے تراشے گئے ہیں ہونٹ اس کے
کہ جیسے کوئی مصوّر خیال "پینٹ"[1] کرے
کہ جیسے نیلے فلک پر کوئی بڑا فنکار
سفید رنگ لکیروں میں سات رنگ بھرے

۱- paint

وہ اُس کے گال کہ جیسے ورق صحیفوں کے
میں چھونا چاہوں تو پل بھر کو ہاتھ رُک جائے
ہوا جو کہہ دے کوئی بات کان میں اُس کے
حیا کی ایک جھلک میرے ساتھ رُک جائے

وہ جس کے ایک تبسم کا رنگ چننے کو
چمن میں آ کے کئی تتلیاں بھٹکتی ہیں
وہ جس کے لہجہ بگڑنے کی اک خبر پا کر
فلک پہ سہمی ہوئی بجلیاں بھٹکتی ہیں

وہ ہنستے ہنستے اگر رو پڑے تو ایسا لگے
کہ جیسے دھوپ دسمبر کی سرد ہو جائے
کہ جیسے سانحہ ہو جائے موسمِ گل میں
کہ جیسے رنگ درختوں کا زرد ہو جائے

وہ اُس کے ہاتھ کہ جن کی حسیں لکیروں میں
کسی کے نام کے دو حرف جگمگاتے ہیں
وہ چھپ کے چومنے لگتی ہے جب ہتھیلی کو
بساطِ وقت پہ لمحے بھی مسکراتے ہیں

جب اُس کے دوش سے آنچل ذرا سرکتا ہے
تو ندیوں کے بہاؤ میں فرق آتا ہے
کہ جیسے جھیل کے ساکن، خموش پانی کو
ذرا سا سنگ فقط ایک پل ہلاتا ہے

مرے گلے میں اگر ڈال کر حسیں بانہیں
کہے کہ کاش یہ لمحے یہیں ٹھہر جائیں
مرے وجود میں بس جائے لمس کی خوشبو
ہر ایک سانس میں نشتر کئی اُتر جائیں

کھلیں جو بندِ قبا آنکھ دیکھ سکتی نہیں
کہ جیسے تیز اُجالا نظر کو دُھندلا دے
کہ جیسے جون کا سورج بڑے غرور کے ساتھ
بصارتوں کے پرانے ہنر کو دُھندلا دے

وہ میرا ہاتھ جو چومے تو مجھ کو ایسا لگے
کہ جیسے سرد ہتھیلی پہ آگ سی برسے
کہ جیسے مردہ پہاڑوں میں پھٹ پڑے لاوا
کہ جیسے شعلہ نکلنے لگے گلِ تر سے

وہ میرے روبرو آئے تو اُس کا ماہِ جبیں
مرے پھٹے ہوئے ہونٹوں پہ یوں ٹھہرتا ہے
کہ جیسے زخم پہ دستِ مسیحا پھر جائے
کہ جیسے درد بھی دھیرے سے رُخ بدلتا ہے

وہ اُس کی چال کہ جیسے ہوا کی سرگوشی
کہ جیسے ریت کے ساحل پہ موجِ آب آئے
کہ جیسے اوٹ سے بادل کی چاندنی اُبھرے
کہ جیسے خشک زمینوں پہ اک گھٹا چھائے

چلے تو دل کی گزر گاہ پر گلاب کھلیں
رُکے تو ماضی ٹھہر جائے حال تھم جائے
کہ جیسے بھول پڑے رقص اپنا رقاصہ
جب اُس کے پاؤں اُٹھیں تال تال تھم جائے

⊙

ہم دونوں ہیں اور یہاں ہے بارش بھی
ساتھ ہمارے رقص کناں ہے بارش بھی

دل میں کیسا پیاس کا موسم ٹھہرا ہے
آنکھوں کے اُس پار عیاں ہے بارش بھی

دُور تلک ہے خاموشی ویرانہ پن
ہمراہِ شوریدہ سراں ہے بارش بھی

ساون دل میں آگ لگانے آیا ہے
پلکوں پر اک بارِ گراں ہے بارش بھی

سوکھی دھرتی کھل کر استقبال کرے
ہریالی کی ایک زباں ہے بارش بھی

ایک اک قطرہ تیر صفت سینے میں چبھے
ہائے کیا سفاک کماں ہے بارش بھی

دشت میں ایک نرالا منظر دیکھا ہے
آگ جلی ہے وہیں جہاں ہے بارش بھی

⦿

جل رہے ہیں جو چار سو خیمے
ہیں یہ کِس کِس کی آبرو خیمے

لوحِ دل پر ہے نقش اِک منظر
آگ، وحشت، دھواں، لہو، خیمے

جب سے آوارگی شِعار ہوئی
ہو گئے ہیں مرے عدو خیمے

میرے دل کی زمین ویراں ہے
کاش اِس میں لگائے تو خیمے

دل کے اُجڑے ہوئے نگر جیسے
میرے زخموں سے ہو بہو خیمے

ہو سکا تو تمہارے شہر کے پاس
آ لگائیں گے ہم "کبھو" خیمے

پوچھ دم توڑتی طنابوں سے
کیوں جلے پیشِ آبجو خیمے

⦿

اک دوجے سے دھوکا کر کے
چین نہ پائیں دونوں مَر کے

اپنا آپ چھپا لیتا ہوں
اندر کے انسان سے ڈر کے

خالی آنکھوں کے دامن میں
کتنا خوش ہوں پیاس کو بھر کے

تیرا پیار ہے کیسی ندیا
سب پچھتائے پیار اُتر کے

جیون میں بس اتنا سکھ ہے
جتنا تیرا آنچل سَرکے

میں آوارہ قیس کے بن میں
تم ہو باسی چاند نگر کے

دُور کے بسنے والے پنچھی
جانتے ہیں آلام سفر کے

گل نے اپنا رُوپ لُٹایا
ہر جھولی میں آپ بکھر کے

آپ نہ آئیں پوچھ کے دل میں
آپ تو مالک ہیں اس گھر کے

پگھلی جائے موم کی گڑیا
دھوپ میں اتنی دیر نکھر کے

⦿

اپنے دشمن سے بھی، بھول کر میں کبھی، کچھ عداوت کروں، میری عادت نہیں
جو مرے ساتھ ہے، زندگی کی قسم، اس سے نفرت کروں، میری عادت نہیں

جانتا ہوں محبت ہے مشکل سفر، بن ترے کاٹنا کتنا دُشوار ہے
ایک اِک گام پر، ہر کسی سے تری اب شکایت کروں، میری عادت نہیں

سانس ٹھہری ہوئی، چاند سہما ہوا، وقت خاموش ہے، مانگ جو جی کرے
ایسے ماحول میں اک ترے نام پر کم سخاوت کروں، میری عادت نہیں

جاں ترے ہجر میں بھول جاؤں تجھے یہ تو ممکن نہیں زندگی میں کبھی
ہاں مگر میں تیرے غم میں دیوانوں سی اپنی حالت کروں، میری عادت نہیں

جس کی خاطر سدا شہر بھر میں پھرے، وہ جلائے دیے غیر کے نام کے
پھر اُسی شخص سے ٹوٹ کر ہر گھڑی میں محبت کروں، میری عادت نہیں

مجھے یاد کرنا

اگر زندگی کے کسی موڑ پر
تم کو ایسا لگے
کہ تم زرد رُت میں بکھرتے ہوئے خشک پتوں کی مانند
یا ایک جنگل میں اِک سمت کھوئے ہوئے کارواں کی طرح ہو
مجھے یاد کرنا

بس میری سنو

وہ کہتی ہے

''اب اس سے آگے کچھ نہ کہو

بس میری سنو

میں مانتی ہوں' یہ اور کسی کا بھی حق ہے

تم کو دیکھے تم کو چاہے

تم سے ٹوٹ کے پیار کرے''

وہ کہتی ہے

''میں جانتی ہوں'

یہ میرے حصے میں جو پیار کا موسم تھا وہ بیت گیا ہے

لیکن دیکھو

میں نے تم سے

جتنا پیار کیا ہے وہ تو اک موسم کے لوٹ آنے تک کافی ہے

لیکن تم نے اس کے بدلے
مجھ کو، میری روح کو، میرے جسم و جاں کو کیا بخشا ہے؟
ایک نہ بجھنے والی آگ،
ایک تڑپ اور اک ایسی پیاس کہ جس نے
میرے ہونٹوں، میری آنکھوں، میرے دل کو
صحراؤں کی تپتی دھوپ میں جلتی ریت کے ذروں میں تقسیم کیا ہے"

وہ کہتی ہے
"تم کیا جانو
میرے حصے میں جو پیار کا موسم تھا
وہ اک موسم کی بات نہیں تھی
تیرے ساتھ گزاری تھی جو
اکتوبر کی ایک فقط اک رات نہیں تھی
ایک صدی پر پھیلا تھا وہ اک اک پل

وہ اک پل جب تم نے میری گود میں اپنا سر رکھا تھا
اور تمہارے ٹھنڈے، یخ بستہ ہاتھوں میں

میں نے اپنے ہاتھ دیے تھے
وہ اک رات نہیں تھی، جانو!

ایک صدی تو اُس پل میں تھی
جس پل میں نے
تیری اشک بھری آنکھوں پر اپنے دونوں ہونٹ رکھے تھے

ایک صدی تو اس پل میں تھی
جس پل، پہلی بار مری زلفوں نے کھُل کر
ایک حجاب بنایا تھا
اور اسی پردے میں دل کی آنکھوں سے
ہم نے اِک دوجے کو ایسے دیکھا تھا
وقت کے پاؤں کی جھانجھر بھی اک پل کو خاموش ہوئی تھی''

وہ کہتی ہے
''بس میری سنو اب کچھ نہ کہو
اب کہنے کو باقی بھی کیا ہے

یہی کہو گے مجھ کو' میری مجبوری کو
تم سے زیادہ کوئی نہیں جو جان سکے گا
لوگ تماشا دیکھتے ہیں
یہی کہو گے......اور کہو گے
تم کو بھی تڑپاتے ہیں وہ سارے لمحے' ساری باتیں
جو اَب یاد کی صورت آنکھوں کے کشکول میں بکھری ہیں

میں جانتی ہوں
تم مجھ سے کہو گے
چھوڑو اَب جانے بھی دو ناں'
ہنس بھی دو ناں' میری خاطر
اور میں یہ بھی جانتی ہوں
بھول کے ساری باتوں کو پھر ہنس دوں گی''

بہت اچھا لگے گا

اگر ہم تم بچھڑ جائیں

دلوں کے آئینہ خانوں میں اِن لمحوں کی جو تصویر آویزاں ہو

اُس پر گرد پڑ جائے

زُباں خاموش ہو جائے

یہ جذبہ سرد پڑ جائے

لکھیں کاغذ پہ لفظِ زندگی

اور اِس کے معنی ''زندگی'' ہی ہوں

میں خود سے دُور ہو جاؤں

کہ اک اک چیز میں کوئی حوالہ ڈھونڈ نا چاہوں
کہیں سود و زیاں کا گوشوارہ ڈھونڈ نا چاہوں
مسلسل اک اذیت ہو
کئی سوچوں کے نشتر ہوں
اور ایسے میں
تمہارا فون آ جائے

ایک زمانہ بیت چکا ہے

اب میں بھی اقرار کروں

میں جھوٹا ہوں

اب تم بھی تسلیم کرو

تم جھوٹے ہو

کئی دنوں کی گرد پڑی ہے چہروں پر

لیکن آنکھوں کی ویران سرائے میں

کتنے آتے جاتے راہی ٹھہرے ہیں

لمحے بیتتے جاتے ہیں

وقت گزرتا جاتا ہے

یاد ہے تم کو ہم دونوں میں

اکثر جھگڑا ہوتا تھا

تم کہتے تھے ہجر کی تلخی دھیرے دھیرے بڑھتی ہے

سوئیاں چلتی رہتی ہیں

سانسیں گھٹتی رہتی ہیں

میں کہتا تھا ہجر کے پہلے وار کو سہنا مشکل ہے

زندہ رہنا مشکل ہے

لیکن دیکھو ہم دونوں نے

ہجر کی تلخی بھی چکھی ہے

اس کا پہلا وار سہا ہے

سمجھوتوں کی اس دنیا میں

ہم دونوں اب بھی جیتے ہیں

کس نے کس کا ساتھ دیا ہے

کون کسی کے ساتھ رہا ہے

یہ غلط فہمی نہیں ہے

میں کہیں ہوں تو کہیں ہے
یہ غلط فہمی نہیں ہے

اپنی اپنی مصلحت کے جال میں
تم بھی خوش ہو میں بھی آزردہ نہیں
زندگی جیسے بھی گزرے یہ عیاں ہے
کوئی بھی دونوں میں افسردہ نہیں

تیری میری دُوریوں کا فیصلہ
ایک جذباتی سا لمحہ تو نہ تھا
ہم بچھڑتے وقت بھی روئے نہ تھے
دل پریشاں تھا سو اتنا تو نہ تھا

اتنے برسوں کی رفاقت کا بھرم
ایک ہی جھٹکے میں تو ٹوٹا نہیں
میں نے یہ مانا زمانہ تھا حریف
زندگی نے ایک دم لوٹا نہیں

پھر بھی تم کہتے ہو اپنے درمیاں
کچھ نہ کچھ ایسے مسائل آ گئے
جانے کیا ضد تھی کہ جس کے بعد سے
مرحلے جیون میں مشکل آ گئے

اب کبھی جب دیکھتا ہوں خط ترے
سوچتا ہوں ان میں کتنا جھوٹ ہے
مسئلے دشواریاں کچھ بھی نہیں
تیرا میرا پیار سارا جھوٹ ہے

میں کہیں ہوں تو کہیں ہے
یہ غلط فہمی نہیں ہے

Stolen Moments

ایک مدّت ہوئی نصیب ہوئے

شام، تنہائی اور کشمکش کے گیت

دل مگر آج بھی وہیں کا وہیں

جس جگہ میرے ہاتھ سرد ہوئے

وہ حسیں شام جس کے آنچل میں

کانپتے ہونٹ بھی مقید تھے

دُور پانی میں ایک کشتی تھی

جس کو واپس ابھی پلٹنا تھا

اور وہ رات جس کے ساتھ چلے
دیر تک دو خیال کے پیکر
ایک مدت ہوئی ہمیں بچھڑے
دل مگر آج بھی وہیں کا وہیں
اور وہ صبح جس کی شبنم نے
دو ستاروں کو جاگتے دیکھا
نیند سے دُور خواب سی آنکھیں
جِن میں آ کر سمٹ گئی دھڑکن
دو دلوں کا قرار دیکھے ہوئے
ایک مدّت گزر گئی جیسے
دل مگر آج بھی وہیں کا وہیں

بکھراؤ

سونے جیسے پاؤں بھی اُس کو دیکھتے ہیں
چاندی کی پازیبیں پہنے چلتی ہے

⦿

مجھ کو اک رات کی مہلت دے دے
تیرا غم تیرے مقابل لے آؤں

⦿

ہزار بار بچھڑنے سے پہلے سوچنا تم
ہم ایسے لوگ دوبارہ نہیں ملیں گے تمہیں

⦿

اُس کے چھوڑ کے جانے کا اندیشہ دل میں رہتا ہے
کبھی نہ گھٹنے والا یہ سرمایہ دل میں رہتا ہے

⊙

مثال ڈھونڈنے نکلے تو ڈھونڈ کر لائے
کہ گل نہیں، تری تصویر لے کے گھر آئے
تمہارے در سے جو اُٹھ کر گئے ہیں اہل جنوں
تو ریگزار کئی، مٹھیوں میں بھر لائے

⊙

بس اسی واسطے نظروں کو جھکا بیٹھا ہوں
تم کو جاتے ہوئے دیکھا نہیں جاتا ہم سے

⊙

جس کا ڈر ہے اسی امکان میں آ نکلیں گے
اب اگر کھوئے ترے دھیان میں آ نکلیں گے

⊙

ایک لُوٹی ہوئی سلطنت کی طرح دل کی جاگیر ہے
خاک بوسیدہ دیوارِ جاں پر مگر تیری تصویر ہے

رتجگوں کا تسلسل کسی طور کیا ختم ہوگا کبھی؟
نیند کے پاؤں میں تیرے خوابوں خیالوں کی زنجیر ہے

سب کو معلوم ہے شامِ غم کا سبب ہم کو حیرت نہیں
اِس مقدر کی تختی پہ اپنی کہانی ہی تحریر ہے

حسرتیں سانس روکے کھڑی ہیں امیدوں کے پاتال میں
خواب کی خون آلود آنکھوں میں پوشیدہ تعبیر ہے

ہر طرف ہے سناں پر چمکتے ہوئے نور کی روشنی
چشمِ قاتل میں پیوست اندھی سیہ رات کا تیر ہے

شب کی آوارگی اک اشارہ ہے اے بزمِ شعروسخن
ایک دستک ہے جو بابِ حیرت کدہ تیری تقدیر ہے

⦿

کوئی ایسا کمال کیجیۓ گا
آپ اپنا خیال کیجیۓ گا
میری جھولی میں رکھ کے سر اپنا
آپ مجھ سے سوال کیجیۓ گا

⦿

ان آنسوؤں کی عطا ہیں ہری بھری آنکھیں
وگرنہ کچھ بھی نہیں ہیں یہ قیمتی آنکھیں

اب اس سے آگے کوئی نقش بھی نہیں بنتا
بنا کے بیٹھ رہا ہوں میں آپ کی آنکھیں

ترے علاوہ کوئی اور کھول سکتا نہیں
لکھا ہے خط کے لفافے پہ جھیل سی آنکھیں

مجھے غزل کے سبھی استعارے بھول گئے
اُٹھیں جو پلکوں کے سائے میں بولتی آنکھیں

⦿

تری جبیں کا ستارا اُداس رہتا ہے
جبھی تو شہر یہ سارا اُداس رہتا ہے
میں سچ کہوں گا مری جان میرے ''جہلم'' کا
ترے بغیر کنارا اُداس رہتا ہے

⦿

درد ایسے ہیں کہ جن کی کوئی تفسیر نہیں
خواب ایسے ہیں کہ رکھتے کوئی تعبیر نہیں

صبر کے بدلے مجھے پیاس عطا کرتے ہو
یہ ترا وعدہ نہیں، میری یہ تقدیر نہیں

کتنے خوش فہم ہیں کہتے ہیں اُتر جائے گی
یہ تری آس ہے زندان کی زنجیر نہیں

کون آئے گا مری سمت پئے چارہ گری
اب تری ٹوٹی کمانوں میں کوئی تیر نہیں

آج بھی اپنوں کے طعنے تو ہیں موجود مگر
جھنگ کی ماہ جبینوں میں کوئی ہیر نہیں

کیسے ڈھونڈو گے مرے نقش، مری بات سنو
سینۂ خاک پہ یہ خون کی تصویر نہیں

وقت کی دُھول میں زنجیر بپا، رقص کناں
''ہجر'' کے لفظ ہیں ''میثاق'' کی تحریر نہیں

⊙

ایک ڈر بستیوں میں رہتا ہے
کون خالی گھروں میں رہتا ہے

زخم کی پیاس کم نہیں ہوتی
آنکھ کی بارشوں میں رہتا ہے

ایک بھگدڑ دکھائی دیتی ہے
کون میری صفوں میں رہتا ہے

اب بھی تیرے وصال کا پنچھی
آس کے گھونسلوں میں رہتا ہے

موسمِ گُل سدا ترے گھر کی
اَدھ کُھلی کھڑکیوں میں رہتا ہے

شوقِ پرواز کا زمانہ بھی
میرے زخمی پروں میں رہتا ہے

اُس کی بخشی ہوئی تھکن کی طرح
اشک بھی راستوں میں رہتا ہے

⊙

ہجر تمہارا دھیرے دھیرے یوں بیکار کرے
قد آور پیڑوں پر جیسے دیمک وار کرے

جس کے واسطے پیار فقط اک کھیل تماشا ہے
پھر بھی دل ہے کتنا بھولا اُس سے پیار کرے

جس کو بوجھل بوجھل پلکیں اچھی لگتی ہیں
اُس سے کہو وہ آ کر مجھ سے آنکھیں چار کرے

جانے کیسا روشن چہرہ ہوگا جس کے لیے
سورج پھر سے واپس آئے اور دیدار کرے

⦿

پہلے سے اپنی ذات میں ٹھہرا ہوا ہے ہجر
جب تم گئے تو اور بھی گہرا ہوا ہے ہجر
یوں تیری یاد دل کے اُفق پر دھنک بنی
آنکھوں کے کینوس پہ سنہرا ہوا ہے ہجر

⦿

وہ میری آنکھ میں کچھ اس طرح اُتر جائے
کہ جیسے کوئی مسافر خوشی سے گھر جائے

کسی طرح تو سنوارو شریر زُلفوں کو
اسی بہانے ہماری سحر نکھر جائے

وہ پہلی بار فقط "آپ کے لیے" لکھنا
یہ دل میں تھا کہ یہ لمحہ یہیں ٹھہر جائے

برآمدے میں بہت دیر اس لیے گھومے
گزرتے وقت کوئی بات تو وہ کر جائے

ہر ایک گام پہ پھیلا مسافتوں کا غبار
اے دشتِ زیست، مسافر ترا کدھر جائے

یہ معجزہ ہے کہ خواہش کہ دل کی مجبوری
اُٹھے نظر تو اُسی کی طرف نظر جائے

⦿

راستوں پر مدار ہے اپنا
راستے چھن گئے تو کیا ہوگا
قربتیں ہم کو راس آئیں نہیں
فاصلے چھن گئے تو کیا ہوگا؟

⦿

گنوا کے اُس کو بہت مطمئن رہا کیسے
اے دل بتا کہ ہُوا تجھ کو حوصلہ کیسے

متاعِ درد اثاثہ ہے میری ہستی کا
کروں گا موسمِ غم خود سے میں جدا کیسے

سراغِ دشت جنوں کس طرح سے پائے دل
پلٹ کے آئے سرابوں سے پھر صدا کیسے

اُسے خبر تھی کہ پورے نہیں مرے حصے
وہ شخص پھر بھی مجھے جوڑتا رہا کیسے

میری ہتھیلی سے اُس کی ہتھیلی دُور رہی
دعا وصال کے موسم کی مانگتا کیسے

وہ کل تلک جنہیں رسموں سے خوف آتا تھا
وہ بن گئے ہیں ترے زعم میں خدا کیسے

ہوا یہ پوچھتی پھرتی ہے ریگِ مقتل سے
سناں کی نوک پہ سَر فخر سے سجا کیسے

تم یقین ہو میرا

شام کی اداسی میں
خواہشوں کی دیوی جب
بے قرار ہوتی ہے
مدھ بھری کسی دُھن پر
رقص گاہ میں کوئی
جسم ڈگمگاتا ہے
ہوش کی فصیلوں سے

بے خودی کا پہلا سنگ

دھم سے آن گرتا ہے

پُرسکوت ساحل پر

بے سکون موجوں کی

پہلی ضرب پڑتی ہے

پھول کو کوئی بھنورا

کانپتی ہوئی لَے میں

مُدّعا سناتا ہے

یاد کا سنہرا پن

مسکراتے حرفوں سے

ایک سطر بنتا ہے

''تم یقین ہو میرا''

اور پھر تیقن سے

آنکھ کی نمی لے کر

میرے ہونٹ دھیمے سے

ان یقیں کے حرفوں پر

مہرِ ثبت کرتے ہیں

چاند مسکراتا ہے

خامشی کے سینے سے

کوئی گنگناتا ہے

"تم یقین ہو میرا

تم یقین ہو میرا"

دوسہیلیاں

حسین ہنستی ہوئی نگاہوں میں کیا چھپا تھا' یہ کون جانے
وہ اُس تجسس کی زرد رُت میں عجیب سی دو پہیلیاں تھیں
ہاں ایک جیسی تھیں اُن کی خوشیاں بھی مسکراہٹ بھی ایک جیسی
اور اُن کے آنسو بھی مشترک تھے وہ دونوں گہری سہیلیاں تھیں

تم کو فرق ہی کیا پڑتا ہے

چاہے میرا نام بھلا دو
چاہت کا پیغام بھلا دو
میری صبح و شام بھلا دو
تم کو فرق ہی کیا پڑتا ہے

چاہے ٹوٹیں سارے بندھن
چاہے اُجڑے میرا جیون
میری آنکھ پہ چھائے ساون
تم کو فرق ہی کیا پڑتا ہے

چاہے چھائے زرد اُداسی
ٹھہرے جیون ندیا پیاسی
میری ہر اک بات ذرا سی
تم کو فرق ہی کیا پڑتا ہے

چاہے سکھ سے ناتا ٹوٹے
چاہے دل سے گھاؤ پھوٹے
محفل میں کہلائیں جھوٹے
تم کو فرق ہی کیا پڑتا ہے

چاہے ڈوبے دل کی ناؤ
صبحوں پر ہو شب کا گھاؤ
سارے وعدے توڑ کے جاؤ
تم کو فرق ہی کیا پڑتا ہے

چاہے کوئی گل مرجھائے
دل میں تیری یاد بسائے
تیری محفل چھوڑ کے جائے
تم کو فرق ہی کیا پڑتا ہے
تم کو فرق ہی کیا پڑتا ہے

خاموشی

اُس نے مجھ سے کہا

دیکھ ہر بات پر یوں اُلجھنا کوئی اچھی عادت نہیں

صرف اظہار کا نام چاہت نہیں

یہ محبت نہیں

خامشی میں چھپا یہ جو اقرار ہے

یہ ہی اظہار ہے

اس سے آگے سبھی لفظ بے جان ہیں

رابطوں میں نہاں، سرد لہجے میں گم حرف کی کشتیاں

آرزوؤں کے بے نام ساحل پہ آ کر ٹھہرتی نہیں

وقت کی قید میں کوئی لمحہ بھی سانسوں سے لڑتا نہیں

خشک پھولوں کی صورت کتابوں میں رکھے ہوئے یاد کے

سارے موسم بھی آنکھوں سے ڈھلتے نہیں

اُس نے مجھ سے کہا

عشق کے باب میں رات بھر بولنا کوئی مشکل نہیں

کتنی نظمیں ہیں باتیں ہیں جو سب حوالوں میں جچتی بھی ہیں

بحث کے واسطے سارا سامان ہے خامشی کے سوا

اُس نے مجھ سے کہا

اُس نے مجھ سے کہا

یہ جو ہونٹوں پہ اب چپ کی مہریں لگی ہیں

یہ اظہار کا اِک وسیلہ بنیں گی

تری میری چاہت کی ساری کہانی جہاں سے کہیں گی

محبت کا سفر بھی کیا عجب ہے

محبت کا سفر بھی کیا عجب ہے
کہ منزل سامنے ہو تو
مسافت راس آتی ہے
یا سنگ میل پر جا کر مسافر راستہ کھونے کی کوشش میں
سفر کے ساتھ چلتا ہے
محبت کے سفر کا ایک ہی انجام ہوتا ہے
مسافت اور بڑھتی ہے
محبت جیت جاتی ہے
مگر سب کچھ گنوا کر بھی
مسافر ہار جاتا ہے

انہونی

جانے کیسے میں نے کہہ دی
جانے کیسے اُس نے سُن لی
ہجر کی بے اندازہ بات

جانے کیسے آنسو روکے
جانے کیسے گُم صم ہو کے
ہم ہارے پھیلائے ہات

جانے کیسے اُس نے مانا
جانے کیسے میں نے سمجھا
تھوڑی دیر ہمارا سات

جانے اب کے کیوں نہیں چھائی
جانے اب کے کیوں نہیں آئی
چاروں آنکھوں میں برسات

عید آئی ہے

روزنِ فکر سے اب حبس کے پہرے نہ اُٹھا
ہو گئے گرد میں گم موسمِ جاناں کے نقوش
آبلہ پا کو سرابوں کا سہارا تو نہ دے
اپنی جھولی میں ہیں اب خانہء ویراں کے نقوش

اب ہمیں کیا ہے اگر دامنِ احساس جلے
تپشِ خون بڑھے، جذبہء دل سرد پڑے
اب ہمیں کیا ہے اگر شہر میں آسیب بسے
یا مرے فن میں رُخِ جانِ غزل زرد پڑے

اب تو کچھ بھی ہو مگر ایک بھرم باقی ہے
کاسۂ نور میں کچھ خواب ہیں اَن دیکھے ابھی
کیا ہُوا آج اگر ہجر نے ڈیرے ڈالے
وصل کی رُت بھی اِسی شاخ پہ ٹھہری تھی کبھی

ہم تہی دست نہیں، ہاتھ کے کشکول میں ہے
ایک آنسو کہ جو عکسِ غمِ تنہائی ہے
درد جاگا ہے تو جانا کہ سحر آ پہنچی
زخم مہکے ہیں تو سمجھے ہیں کہ عید آئی ہے

⦿

خشک ہونٹوں کے برابر رکھ دیے
وقت نے کیسے سمندر رکھ دیے

"العطش" کی اک صدا نے دشت میں
پیاس کے معنی بدل کر رکھ دیے

بھول بیٹھا جب میں اُڑنے کا ہنر
سامنے تو نے مرے پَر رکھ دیے

خالی اُس در سے کوئی لوٹا نہیں
کچھ نہ تھا تو طشت میں سَر رکھ دیے

⦿

جب وصل سے واقف ہوں کبھی ہجر شناساں
پھر شہرِ ہوس بھی ہے وہی کوچہء جاناں

پھر بڑھنے لگی اور بھی تاریکیٔ دوراں
پھر چھپنے لگا آنکھ سے اک صبح کا امکاں

پھر فن کے خریدار بنے شہ کے خزانے
پھر فکر کے محبس میں ہوئے لفظ پریشاں

پھر ہو کے رہے گا کوئی مصلوب مسیحا
سب مہر بلب منتظرِ اذنِ فقیہاں

پھر دید کے ناخن نے کریدا ہے وہی زخم
وہ زخم جواب تک ہے تہِ خواہشِ درماں

⦿

دل اگر اپنی دسترس میں نہیں
یہ نہ سمجھو کہ اُس کے بس میں نہیں

خامشی فکر کی عبادت ہے
کچھ سکوں نالہء جرس میں نہیں

جو ترے ساتھ ہم گزار سکیں
ایک لمحہ بھی اِس برس میں نہیں

ہے میسر مری قناعت کو
ذائقہ جو تری ہوس میں نہیں

سوچ میں ہیں خزانے لفظوں کے
اور دیکھیں تو کچھ بھی بس میں نہیں

⊙

دل کسی کے طلسم میں گُم ہے
روح اپنے ہی جسم میں گُم ہے
میری قسمت کے زاپچوں کا نظام
ایک تیرے ہی اِسم میں گُم ہے

⊙

ساعتِ ہجر کے امکان سے ڈر لگتا ہے
آنے والے اِسی طوفان سے ڈر لگتا ہے

اب کے یوں خون سے تَر خواب ملے ہیں جاناں
آنکھ کو زخم کی پہچان سے ڈر لگتا ہے

اُس سے کہنا کہ کبھی خود کو مکمل کر لے
جس کو ٹوٹے ہوئے انسان سے ڈر لگتا ہے

آگ نے ایسے جلائی ہیں وہ جاگی پلکیں
یاد کو نیند کے شمشان سے ڈر لگتا ہے

لب کے کشکول میں بس پیاس کا پھیلاؤ ہے
ہم کو صحرا ترے احسان سے ڈر لگتا ہے

⦿

یہ سچ ہے کچھ عداوت بھی نہیں تھی
اُسے مجھ سے محبت بھی نہیں تھی

میں کس کے واسطے رستہ بدلتا
اُسے میری ضرورت بھی نہیں تھی

وہ اب در پر تمہارا منتظر ہے
جسے دستک کی عادت بھی نہیں تھی

ترا آنچل جو میری چھت پہ آیا
ہوا کی وہ شرارت بھی نہیں تھی

ہمیں، جاناں، ترے ملنے سے پہلے
"نہیں" سننے کی عادت بھی نہیں تھی

⦿

میری نظر میں اِس سے بڑا حادثہ نہیں
وہ شہر میں ہے اور کوئی رابطہ نہیں

ملتے بچھڑ کے روز سفیرانِ اہل دل
ترکِ تعلقات کوئی سلسلہ نہیں

پلکوں کے دائرے میں مقدس وکیل ہیں
غم کی عدالتوں کا کوئی ضابطہ نہیں

سینوں میں جو تھا جوشِ بغاوت وہ کیا ہوا
حالانکہ گھر سے دار تلک فاصلہ نہیں

خانہ بدوش ہیں، ہمیں خیمے لگانے دو
مانا تمہارے شہر سے کچھ واسطہ نہیں

⊙

صرف اتنی ہوئی خطا مُجھ سے
خود کو ڈھونڈا نہیں گیا مُجھ سے

بُجھ گیا کیوں ہوا کی آہٹ سے
وہ جو منسوب تھا دِیا مُجھ سے

ایک ہی غم ہے اپنا عہد وفا
تجھ سے ٹوٹا ہے، ٹوٹتا مُجھ سے

جس کی باتوں کا آسرا تھا مجھے
اُس نے کچھ بھی نہیں کہا مُجھ سے

جس کی خاطر میں راستوں میں رہا
اُس نے رکھا ہے فاصلہ مُجھ سے

خود کو بیچو نہیں

میں نے مانا کہ یوسف ہو اور مصر کا
وہ ہی بازار بھی ہے خریدار بھی
میں نے مانا کہ مجبوری جیون کی سانسوں پہ اِک بار ہے
جینا دشوار ہے

وقت کا بادشہ سیم و زر سے لدے
ایک میزان پر ہاتھ رکھے ہوئے
طے شدہ فیصلے کا تمنائی ہے
خامشی چھائی ہے
میں نے مانا کہ تم دسترس سے مری کس قدر دُور ہو
تم بھی مجبور ہو

سب بجا ہے مگر ''میرے یوسف سنو''
جنس بکتی ہے انسان بکتے نہیں
اور انساں بھی وہ جس کو چاہت ملے
سب سے بڑھ کر ملے
میرے یوسف سنو خود کو بیچو نہیں

مرے سخن پہ ہوا نقش تیرے ہجر کا رنگ

شعور و فہم کی سرحد سے کتنی دُور پرے
میں سوچتا تھا کبھی میں بھی لفظ لکھوں گا
ترے جمال کے خوش بخت موسموں میں کبھی
میں تیرے حسن کی ساری تہوں کو سمجھوں گا
گلاب کی طرح کھلتے ہوئے ترے عارض
کنول نما تری آنکھوں کے خوشنما دو جام
وہ تیری زلف کہ شاموں کی پہرہ دار سدا
وہ تیرے ہونٹ کہ جن سے جلیں گلاب کے رنگ

کسی خیال میں ڈوبا وہ پُر شکن ماتھا
وہ تیرے ہاتھ کسی باکمال فن کی جھلک
ترے وصال کا موسم، حسین موسم تھا
مری غزل میں تبسم کی لو مچلتی تھی
ہر ایک نظم میں تیرا ہی رنگ کھلتا تھا
مرے حروف سرِ بزم رقص کرتے تھے
مرا کلام مسرّت کا آئنہ بن کر
ہجومِ شہر میں خوشیاں تلاش کرتا تھا
پھر ایک دن تو اچانک بچھڑ گیا مجھ سے
ورق پہ کتنے ہی رنگوں کے عکس رونے لگے
قلم نے چھوڑ دیا خامشی میں کچھ کہنا
خیالِ یار کی چپ چاپ رہگزاروں پر
کہ مجھ کو چھوڑ کے تنہا، اُداس، آوارہ
مرے حروف نے یادوں کا مرثیہ لکھا
میں کوئی لفظ تراشوں تو آنکھ بھر آئے

تیرا خیال جو آئے تو غم کے میلے میں
میں اپنے جسم کا سایا تلاش کرتا ہوں
مرا سخن مجھے اب اور کچھ نہ لکھنے دے
مری غزل میں اُداسی کا رتجگا ٹھہرا
اُداس ہو گئیں سوچیں ترے بچھڑنے سے
بساطِ درد پہ پھیلی ہوئی رتوں کے سنگ
میں ترے ہجر کے صدمات لکھتا رہتا ہوں
مرے سخن پہ ہوا نقش تیرے ہجر کا رنگ

Happy Birthday

اُسے میں نے جنم دن پر مبارک پیش کرنی ہے
کہ جس کی آنکھ میں ٹھہرے ہوئے دلکش حسیں موسم
بہت ہی خوبصورت ہیں
وہ جس کے نرم لہجے میں
کئی خاموش جھیلوں کا تکلم سانس لیتا ہے
وہ جس کی صاف پیشانی پہ
سورج کی حسیں کرنوں کا دِن بھر پہرہ رہتا ہے
وہ جس کی چاپ سننے کو بہت سے سبز پتے
سبز شاخوں سے چھڑا کر سانس کا رشتہ
کنارِ رہگزر پر آ کے گرتے ہیں
اُسے میں نے جنم دن پر مبارک پیش کرنی ہے

فیصلہ غلط نکلا

اہل درد کہتے ہیں
دل کی مان کر جو بھی
فیصلے کیے جائیں
چاہے وہ غلط نکلیں
اک سکون ملتا ہے

اُس کو میں نے چاہا تھا
دل کا فیصلہ تھا یہ
فیصلہ غلط نکلا
میں بکھر کے ٹوٹا ہوں

ایک خواب کی صورت
دے گیا وہ خاموشی
اِک عذاب کی صورت
چپ لگی مجھے جب سے
لوگ یہ سمجھتے ہیں
وہ بھی یہ سمجھتا ہے
اک سکون ہے مجھ کو

یہ کم نہیں ہے

یہ کم نہیں ہے
کہ نفرتوں کے غبار موسم میں
کوئی تو ہے جو چاہتوں کی مدھر سی لَے میں
بسی ہوئی دُھن کو چھیڑتا ہے
کوئی تو ہے جو اُداس اُجڑی ہوئی رُتوں میں
لبوں پہ حرفِ دُعا سجائے ہوئے کھڑا ہے
کوئی تو ہے جو کہ سادہ کاغذ پہ
مسکراہٹ کے نت نئے لفظ لکھ رہا ہے
کوئی تو ہے جس کو اس زمانے میں غم نہیں ہے
کہ جس کی پلکوں کا کوئی کونا بھی نم نہیں ہے

⊙

سوچتا ہوں کہ کیسے گزرے گی
زندگانی تری طلب کے بغیر
اس سے پہلے کہ میں بدل جاؤں
روٹھ جاؤ کسی سبب کے بغیر

⊙

ترے بغیر ادُھورا ہوں کتنے سالوں سے
کہ اب تو عمر جھلکنے لگی ہے بالوں سے

ہمارا صرف محبت کا ہی نہیں رشتہ
وہ جانتا ہے مجھے اور بھی حوالوں سے

بشر کی سوچ کی وسعت سے ماورا ہے جو
میں اُس کا عکس تراشوں تری مثالوں سے

گزر رہا ہے سکوں سے یہ کون پردہ دار
حجاب کرنے لگے خواب بھی خیالوں سے

تری عطا سے گنوائی ہیں اس طرح آنکھیں
کہ اب تو خوف سا آنے لگا اجالوں سے

⦿

زندگی ہم کو بہت پیاری تھی جس کے دَم سے
سانس کا ربط بھی ٹوٹا ہے اُسی کے غم سے

اس قدر آپ سے بیزار ہوا ہے یہ دل
اپنے ہی ناز اُٹھائے نہیں جاتے ہم سے

رات بھر اب بھی گھنی چپ کا فسوں ٹوٹتا ہے
اُسی لہجے اُسی آواز کے زیر و بم سے

برف تو پگھلی نہیں آپ کے دو ہونٹوں کی
کتنے الفاظ گرے آپ کی چشمِ نم سے

⊙

کوئی لمحہ تری یادوں کے علاوہ گزرے
یہ تو یوں ہے لبِ دریا کوئی پیاسا گزرے

وقت کی تیز اَنی پر ہے ملاقات کی رات
آج تو کوئی محبت سے شناسا گزرے

شدتِ تشنہ لبی ضبط سکھائے اتنا
ہم یونہی مست رہیں، پاس سے دریا گزرے

کہنے کو شہر میں تنہائی بہت ہے لیکن
رہ گزر سوچ رہی ہے کوئی تنہا گزرے

میں تری یاد کو پلکوں پہ کہاں تک رکھوں
رتجگا سوچے کہ اب نیند کا سایا گزرے

Happy New Year

کتنے لمحے تھے جنہیں وقت نے رُکنے نہ دیا
کتنی باتیں تھیں کہ ہونٹوں پہ ہی حیران رہیں
کتنی یادیں تھیں جنہیں لفظ کے پیکر نہ ملے
کتنے وعدے تھے کہ آنچل میں بندھے بھول گئے
آج پھر سال کا پیمانہ وہیں پر چھلکا
نیند کے خوف سے جاگی ہوئی آنکھوں سے پرے
یاد کے بھیس میں پھر آج دسمبر گزرا
پھر نیا سال، نئے رنگ، نیا پیراہن
حبس ماحول سے نکلیں تو اُدھر بھی دیکھیں
یاد کے باب میں وعدوں کے حوالے سے کوئی
حرف سے حرف ملاتے ہوئے اک نظم لکھیں

کسی سے مشورہ کرلو

تو پھر اک بار سوچو
پیار کرنا اس قدر آساں نہیں جتنا سمجھتی ہو
بہت آرام سے سوچو
کسی سے مشورہ کرلو
ابھی تم عمر کی اُن ساعتوں میں ہو
جہاں پھولوں کا کھلنا بھی تمہارے ہی تبسم کی ذرا سی ایک جنبش کی
علامت ہے
ابھی تو عمر کے وہ سال ہیں جن میں
تمہاری چال کی رفتار کے صدقے ہوائیں رقص کرتی ہیں
تمہاری گہری آنکھیں جھیل کے پانی پہ جیسے وار کرتی ہیں

بہت آرام سے سوچو
کسی سے مشورہ کرلو
محبت کونبھانا اس قدر آساں نہیں، جتنا سمجھتی ہو
چلو پھر بھی اگر تم یہ سمجھتی ہو
محبت کونبھانا اس قدر مشکل نہیں جتنا بتاتے ہیں
تو ہم کو کیا...... کرو تم پیار...... لیکن دل کی کشتی کو
محبت کے سمندر میں رواں کرنے سے پہلے
تم کسی سے مشورہ کرلو
محبت کونبھانا اس قدر آساں نہیں جتنا سمجھتی ہو
تمہاری عمر کے یہ سال گنتی میں وہی ہوں گے
مگر ان خوشنما ہونٹوں کے اس دلکش تبسم کی جھلک بھی تم نہ دیکھو گے
حسیں پھولوں، ہواؤں اور جھیلوں میں اُداسی خیمہ زن ہوگی
بہت آرام سے سوچو، کسی سے مشورہ کرلو
محبت کونبھانا اس قدر آساں نہیں جتنا سمجھتی ہو

تصوّر

تو نہیں تھا مگر ترے گھر میں
ہر جگہ تیرے لمس میں کھوئے
تیرے تکیے سے تیری باتیں کیں
اپنے حصے کا کھل کے ہم روئے
ڈھیر رونے کے بعد اشکوں سے
اپنی آنکھوں کے دائرے دھوئے
ایک مدت سے جاگنے والے
تیرے بستر میں دیر تک سوئے

سپردگی

سپردگی کا وہ پہلا لمحہ تھا
پہلا بوسہ کہ جس کی حدّت سے اب بھی میرے پھٹے ہوئے ہونٹ
اور اس کے حسیں بدن کا ہر ایک حصہ جھلس رہے ہیں
سپردگی
جس کی تہہ میں تشنہ خیال دریا کو ڈھونڈتا ہے
سپردگی
زندگی کے بدلے ہوئے روّیے کا اک تسلسل
سپردگی اک صدا ہے اس کی پکار میری
سپردگی اُس کی جیت ہے اور ہار میری

تعلق

لاکھ تم دُعا مانگو
ٹوٹتے ستاروں میں
خواب جڑ نہیں سکتے
ٹوٹتے ستاروں کے
اپنے خواب تو دیکھو
کیسے ریزہ ریزہ ہیں
ریزہ ریزہ خوابوں کو
جوڑنے کی حسرت ہے
سو دُعا سہارا ہے
دونوں خالی ہاتھوں کا یہ بھی اک تعلق ہے
اور اِس تعلق کو
ٹوٹتے ستاروں نے
کیسے باندھ رکھا ہے

⦿

کیا کہے گا جہان، رہنے دو
بس مرے دل کا مان رہنے دو

ہم تو اک پل جدا نہیں ہوں گے
ہو سکے تو گمان رہنے دو

دھوپ میں جل نہ جائیں یہ لمحے
یاد کا سائبان رہنے دو

ہاتھ سے ہاتھ چھوٹنے کے سمے
لمس کا اک نشان رہنے دو

عشق کرنے کا یہ جنون، خیال
چھوڑ دو، میری جان، رہنے دو

◉

قفس بھی توڑ کے آتے ترے اشارے پر
ہمارے بس میں نہیں تھے مگر ہمارے پر

متاعِ ہجر گنوا دیں مگر یہ سوچتے ہیں
پھر اس کے بعد جئیں گے تو کس سہارے پر

چلو کسی تو بہانے قیام ممکن ہو
کہ ٹوٹ جائیں سبھی کشتیاں کنارے پر

ہمیں خبر تھی کہ یہ ساتھ تھوڑی دیر کا ہے
سو ہم نے آس رکھی ٹوٹتے ستارے پر

⦿

ہمیں خبر ہے کہ نقصان کر کے بیٹھے ہیں
ہم اپنے دل پہ بڑا مان کر کے بیٹھے ہیں

سنا ہے اس کو خرابوں سے پیار ہے سو ہم
دل و نگاہ کو ویران کر کے بیٹھے ہیں

نہ ٹوٹ جائے کہیں سلسلہ توجہ کا
اک ایک پل کو ترا دھیان کر کے بیٹھے ہیں

ترے علاوہ تیرے شہر میں تری خاطر
ہر ایک شخص سے پہچان کر کے بیٹھے ہیں

⦿

تیرے لہجے کی دھوپ چھاؤں ہے کیا
یاد کے سائبان کے نیچے

تم ملو گے، نہیں ملو گے مجھے؟
اک یقیں ہے گمان کے نیچے

ایک پرواز تیرے ساتھ بھی ہو
اس کھلے آسمان کے نیچے

فردیات

اب اپنے ہار جانے کا یقیں آنے لگا ہے
کہ اُس کے نرم لہجے میں "نہیں" آنے لگا ہے

⊙

دل نے تو بہت دیر چھپایا غمِ ہجراں
آنکھوں سے عیاں ہوگئیں اِک شخص کی یادیں

⊙

خزاں رسیدہ تھے ایسے بہار رُت میں بھی
تمہارے ساتھ سرِ شاخ ہم نہ رہ پائے

⊙

کسی کی ہار کا ڈر تھا سو ہم آغاز سے ہارے
ہمیشہ جیتنے والے عجب انداز سے ہارے

⊙

حسین آنکھوں میں ٹھہرے وصال موسم سے
تمہارے ہجر کی ساعت ارادتاً مانگی

⊙

پھر یقیں کی بساط پر تجھ سے
میں بہت اعتماد سے ہارا

⊙

ٹوٹی جب بھی آس کسی کی کوئی ہوا برباد
پلکوں پر دھیرے سے آ کے ٹھہری تیری یاد

⊙

جڑ کر بھی اب نقش اُدھورے رہتے ہیں
تیرے ہاتھ سے گر کر ایسے ٹوٹ گئے

⦿

موسمِ ہجر تری ایک سخاوت کے عوض
درد سے بھر گیا دامن جو کبھی خالی تھا

⦿

چپ ہو گیا وہ شخص مرا ہاتھ چوم کر
پلکوں پہ اس کے بعد نمی تیرنے لگی

⦿

اپنے اور میرے تعلق کو یونہی توڑ نہ دے
ختم کرنی ہے کہانی تو نیا موڑ نہ دے

⦿

یہ آئنے تجھے تصویر تیری کیا دیں گے
مری تھکی ہوئی آنکھوں میں خود کو دیکھ کبھی

⦿

اپنی چاہت بھی کم نہ تھی لیکن
ہار جانے کا غم زیادہ ہے

⦿

دیکھنا رک جائیں گی یہ دھڑکنیں
دیکھنا ہم بھول جائیں گے تمہیں

⦿

گھڑا کچا، ہمیں تسلیم، لیکن
کسی کے نام سے پکا جڑا ہے

⦿

مجھ کو اک شام تو عطا کر دے
کل ترا شہر چھوڑ جانا ہے

سائیں، وقت کی چال نے ہم کو ایسا کیا نڈھال
سائیں، رستے گرد ہوئے اور حال ہوا بے حال
سائیں، درشن کے پیچھے کھو گیا اپنا روپ جمال
سائیں، ہمارے حصے میں آیا ہے حرفِ زوال
سائیں، ایک نظر ڈالو، ہو جائے بات بحال

سائیں، من کو نا سمجھائیں، من میں ایک بھنور
سائیں، منزل جانے کہاں ہے؟ ہر اک گام سفر
سائیں، ہم آوارہ پنچھی، بنجارے، بے گھر
سائیں، ہماری پلکوں پر ہے خوف، دلوں میں ڈر
سائیں، پھر بھی آس لگی ہے، دیکھو! ایک نظر

سائیں، ہم نے پیار کیا ہے، پیار نہ آیا راس
سائیں، درشن کر کر دیکھے، پھر درشن کی پیاس
سائیں، پیار کے مارے دل کو پیا ملن کی آس
سائیں، اپنے حصے آئی کہ ہر اک شام اداس
سائیں، ہجر کے وحشی لمحے جن میں بیتے ماس
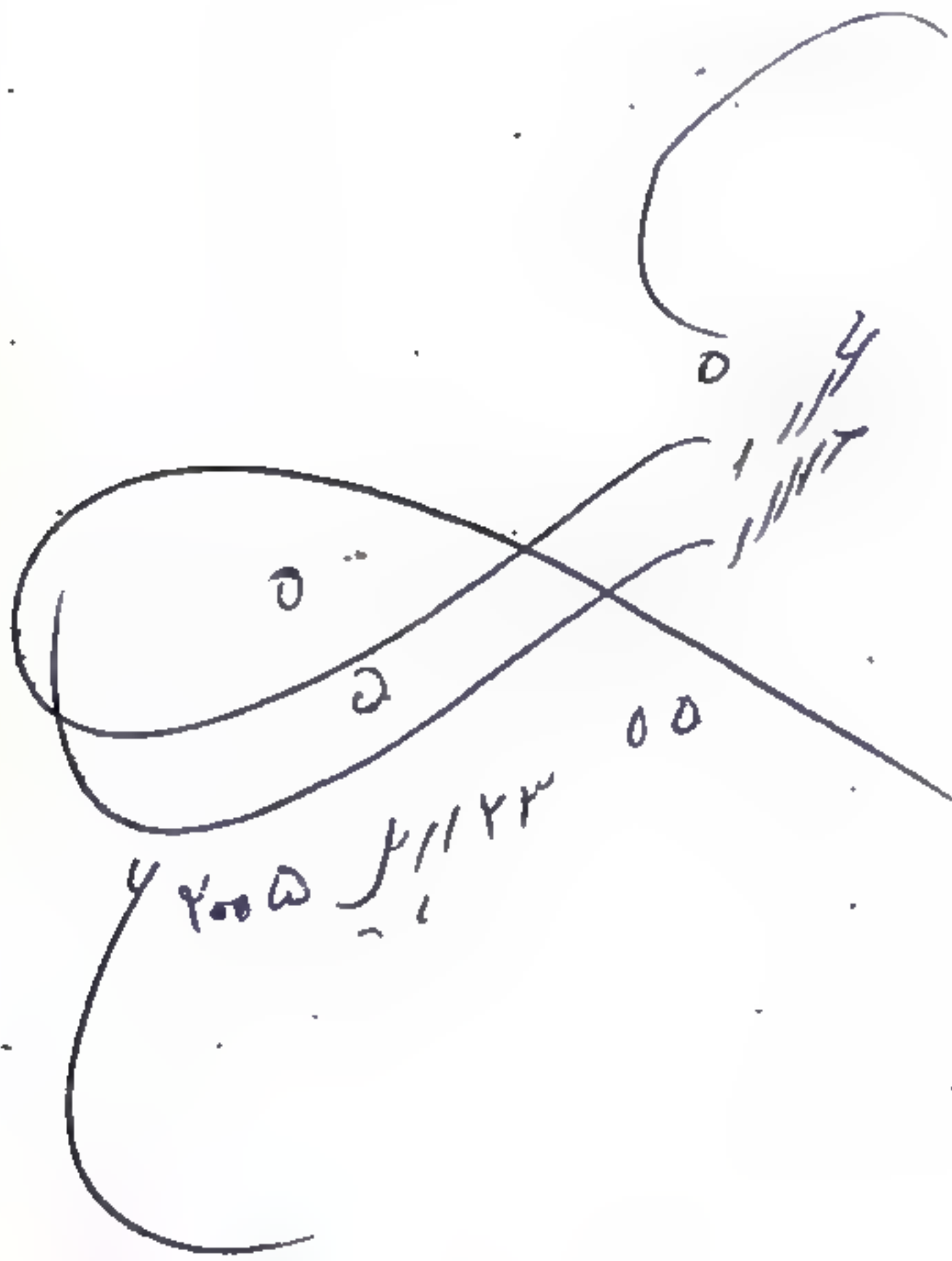
محبت کا سفر بھی کیا عجب ہے

محبت کا سفر بھی کیا عجب ہے
کہ منزل سامنے ہو تو
مسافت راس آتی ہے
یا سنگِ میل پر جا کر مسافر راستہ کھونے
کی کوشش میں
سفر کے ساتھ چلتا ہے
محبت کے سفر کا ایک ہی انجام ہوتا ہے
مسافت اور بڑھتی ہے
محبت جیت جاتی ہے
مگر سب کچھ گنوا کر بھی
مسافر ہار جاتا ہے

آؤ اک عمر کی جدائی کو
وصل کے ایک پل سے تولتے ہیں

نعیم رضا بھٹی
تمام کتب بغیر کسی مالی فائدے کے پی ڈی ایف میں تبدیل کی جاتی ہیں۔
کتابی مواد کی ذمہ داری مصنف پر ہے۔
03448183736
03145951212

ایقان

209
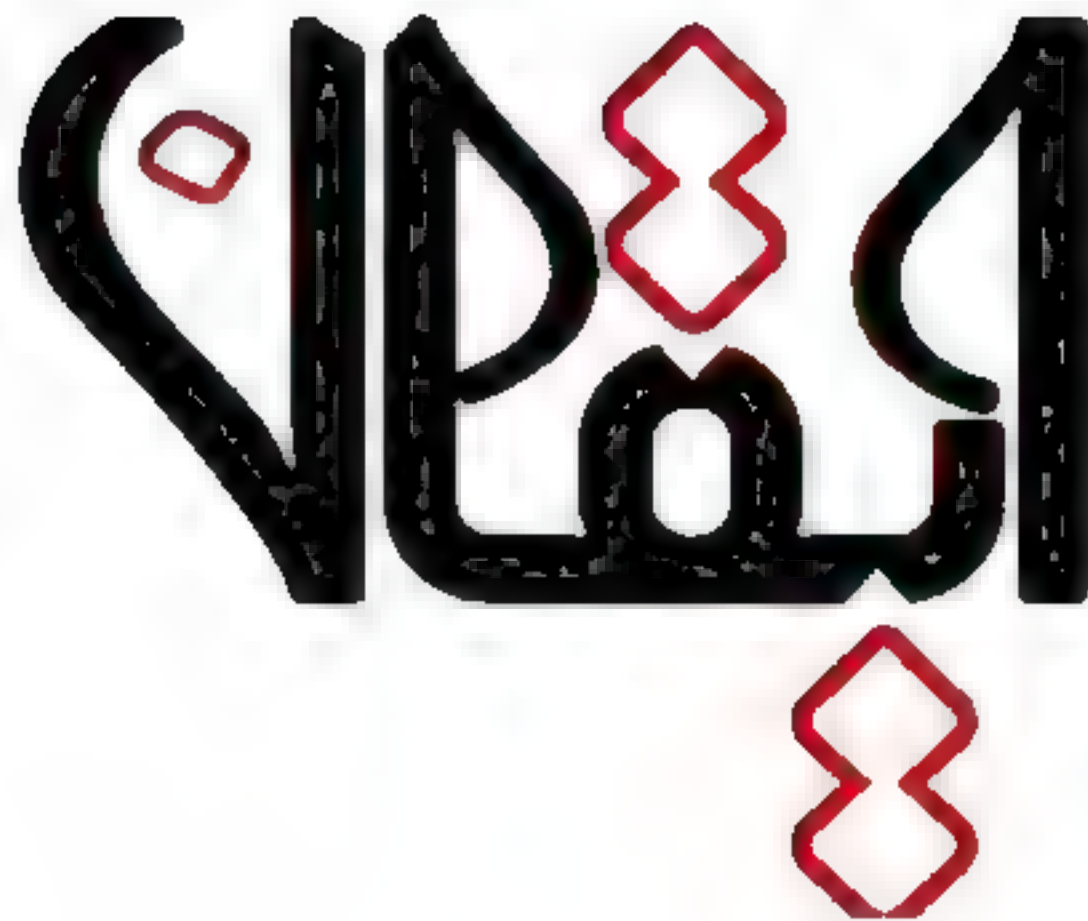
نعیم بھٹی نے چیک میٹ پرنٹنگ پریس لاہور سے چھپوا کر
انحراف پبلی کیشنز
C/1۔ ایل ڈی اے پلازہ، 55۔ لارنس روڈ لاہور سے شائع کی

Author :
Naeem Raza Bhatti
Bhatti House ,Near :
Thana Paharia'n Wali
Dist. Mandi Baha ul Din
email:poetnaeemrazabhatti@gmail.com
www.facebook.com/poetnaeemrazabhatti
Cell.No:0344-65 48 104

ملنے کا پتہ:
بک کارنر شوروم، بالمقابل اقبال لائبریری
اقبال لائبریری روڈ، بک سٹریٹ۔ جہلم
0321-5440882 / 0544621953

ایقان

نعیم رضا بھٹی

انحراف
PUBLICATIONS
انحراف پبلیکیشنز لاہور، اسلام آباد

2009

اہتمامِ اشاعت : رحسن حفیظ، نعیم گیلانی
انتخاب : حلقہ اربابِ ذوق منڈی بہاؤالدین
نمودِ اول : جنوری دو ہزار انیس
سرورق : فرزاد علی زیرک
تزئین و زیبائش : قاسم حسن گیلانی
مشینی خطاطی : سید مہدی
تعداد : پانچ سو

"EQAAN"
(Urdu Poetry by)
Naeem Raza Bhatti

Printed by:
Dawar Packages
6/Nisbat Road,Lahore.
Price : 300 PKR (21.5)
Published by :
INHIRAAF PUBLICATIONS
C/1LDA Flats55,Lawrance Road
LAHORE.
Cell :+333 650 9204
H/no 106 St/13 Phase 1 Margla Town.
ISLAM ABAD
Cell :+0300 514 5743
E,Mail:
Inhiraaf_publication@yahoo.com

انتساب !

دادا حضور حاجی محمد علی بھٹی مرحوم

دادی جان مرحومہ

والد محترم حاجی محمد عارف بھٹی

اور والدہ محترمہ کے نام

جن سے محبت کرنا سیکھا

ارمغان احمد اور ایمان فاطمہ کے نام

جن سے محبت کرتا ہوں
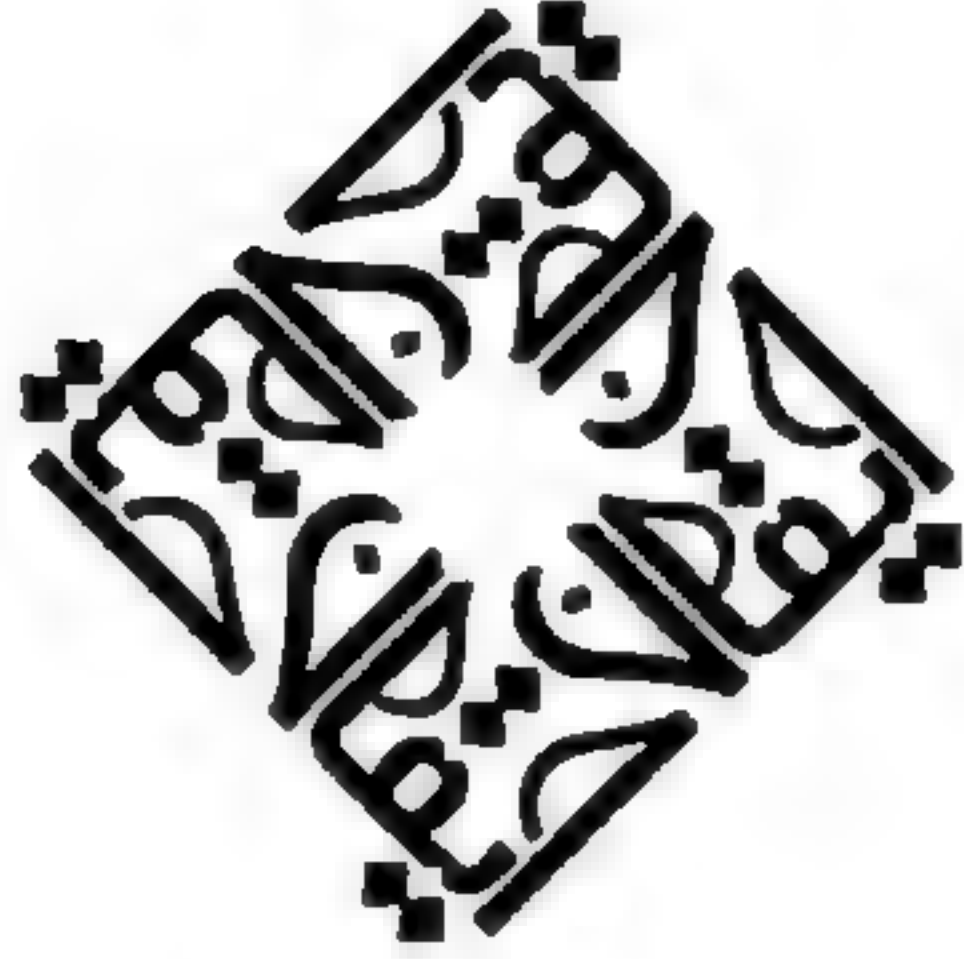
تجھ سے مرا وجود سنبھالا نہ جا سکا !
میں نے ترا غبار بھی رکھا سمیٹ کر

209

فہرست

حرفِ چند.....!!

میں نعیم رضا بھٹی کے خلوص کا قائل، محبتوں کا گھائل اور اس کے شاعر ہونے کا معترف ہوں۔ اب ایسے لوگ خال خال ہی نظر آتے ہیں جن کے لیے ادب زندگی کا بنیادی مسئلہ ہے دھوپ اور ہوا کی طرح بنیادی۔ نعیم رضا بھٹی ایک ایسا ہی شخص ہے۔ بڑے ادبی مراکز سے دور منڈی بہاؤالدین میں رہ کر وہ معاصر ادبی منظرنامے سے اور ملک بھر میں بلکہ ملک سے باہر ہونے والی ادبی سرگرمیوں سے پوری طرح باخبر اور منسلک رہتا ہے۔

نعیم رضا بھٹی کے تخلیقی لمحات صرف اسے ہی نہیں، اس کے ہاں برتے جانے والے زبان واسلوب کو بھی پگھلا ڈالتے ہیں۔ آتش فشاں سے پھوٹنے والے تند و تیز لاوے کی طرح۔ غالباً "یگانہ" نے کہیں کہا ہے کہ شاعری بات میں ایک آڑی کن لگانے کا نام ہے نعیم کے ہاں یہ آڑی کن کہیں کہیں ترچھی یا ٹیڑھی بھی ہو سکتی ہے اس کے بعض پیرایہ ہائے اظہار کے بارے میں جی چاہتا ہے کہ اپنے قصورِ فہم کا اعتراف کرتے ہوئے اس سے ان کے مدلولات دریافت کیے جائیں مگر پھر خیال آتا ہے کہ چھوڑو یہ اپنی تپشِ باطن سے پگھل کر کچھ کا کچھ ہوا جا رہا ہے۔ اسے اپنے لہو کی تندرو میں بہنے دو۔

اگر کچھ میل نکلے گا تو کچھ سونا بھی ضرور نکل آئے گا۔

نعیم رضا اگرچہ نظم کے "نکتہ ملفوف" میں بھی تاثیر پھونکنے کا فن جانتا ہے مگر اسے شغف غزل ہی سے ہے جو بیک وقت یک رنگ و صد رنگ صنفِ سخن ہے۔ تضادات کے تار و پود ہی سے غزل کی بافت میں نو بہ نو نمونے اٹھتے ہیں۔ انہی نو بہ نو نمونوں کے عکس ہمیں نعیم رضا

بھٹی کے نگار خانہ، غزل میں بھی جلوہ گر نظر آتے ہیں:

شیشے نے انگڑائی لی

اور خود سے دوچار ہوا

آخرش اس بدن کی بنیاد میں

ہل گئیں اور اسے پتہ نہیں تھا

مرنے والے نے صرف اتنا کہا

موت کا کوئی ذائقہ نہیں تھا

میں روشنی کے بیج بو کے سو گیا

چراغ اگ رہے ہیں کشت خواب سے

کیا مرے بس میں کچھ نہیں رکھا

غیب سے آئے گا اگر تم بھی

بجھ چکے ہیں چراغ اندر سے

اس میں سورج کا کوئی ہاتھ نہیں

سب سے عمدہ پھول ہو تم

دنیا کے گلدستے میں

ان دنوں نیند کا درندہ بھی

میری آنکھوں کے اختیار میں ہے

سانس بے ربط ہو تو لگتا ہے

جلتا بجھتا ہوا دیا ہوں میں

کورا ہونے سے پیشتر میں نے

ایک اک رنگ اختیار کیا

نعیم رضا بھٹی نے روایت کے جمالیں تسلسل کو آج کے مشینی ماحول سے جس طرح پیوست کیا ہے اس کا بھرپور اظہار اس کے ایک شعر میں یوں ہوا ہے:

نازکی ان لبوں کی لیتا ہوں

میں کلاسیکی کارخانے سے

نعیم رضا بس اپنے آپ میں مگن ہے۔ اپنے ساتھ دن کاٹتا ہے اور اپنے وجود کے نشے سے لبریز رہتا ہے۔ اس کی ہمواری اور کھردرا پن دونوں اس کے اپنے ہیں۔ وہ اپنے طرزِ سخن کے بارے میں بہ بانگ بلند کہتا ہے:

سخن ہے رزق، مجھے بھی ملا مرا حصہ

مرے کہے پہ کسی کی نہیں ہے چھاپ سنو

اس کے اس دعوے کی تصدیق اس کی انوکھی تمثالوں اور تعبیروں سے ہوتی ہے جن میں کہیں "کم آمیز خواب" ہیں کہیں "دھوئیں کی ٹاپیں"، "لووں کا ملبہ" اور پختہ مکانوں کی اڑتی تھکن سے کہانیاں دہکتی ہیں، پتوں سے انکار جھڑتا ہے اور سرِ شاخ پیاس کھلتی ہے۔

نعیم رضا بھٹی کا اولین مجموعہ شعری "ایقان" اس کی ذات کی طرح برجستہ و بے نیام ہے۔ میں ایوانِ ادب میں اس مجموعے کا خیر مقدم کرتا ہوں۔

ڈاکٹر خورشید رضوی

نعیم رضا بھٹی اور معنی کی تکثیریت

اسلوب سازی کی ضمن میں لفظیات کا دروبست اور لوازموں کے تناسبات کا ایک خاص ڈھب وضع کرتا ہوا پیٹرن ترکیب پا جائے تو معنی کے مختلف معروضات کا ظہور پاتا ہے۔ موسیقی میں سروں کی اکائیوں کو دوسری اکائیوں کیساتھ ملا کر مجموعے بنانے کے عمل کو "النکار" سے موسوم کیا جاتا ہے اور میں شاعری / بالخصوص غزل/ کے فنی ڈھانچوں کو اسی قاعدے کی رو سے دیکھنے کو مناسب سمجھتا ہوں کہ کم از کم ہم اس بات کہ "الفاظ آوازوں کا مجموعہ" ہوتے ہیں کی درست ڈھب سے سوجھ بوجھ حاصل کر کے معنی تک پہنچیں۔ Onomatopoeia کی رو سے چیخ کا ردھم اور ٹیس پہ اٹھنے والی سسکاری، تاسفی کلمات اور استعجاب کے صوتی اشارے غرض یہ کہ ہر طرح کے کنائے جن پر صوتیات کے ضابطے لاگو ہوتے ہیں ہر انسان کے ہاں یکساں نوعیت سے ظہور کرتے ہیں۔/ البتہ ان کی اثر پزیری اور معنوی امتزاج متنوع ہے/ شاعری میں لفظ/ آوازوں کے مجموعے/ صوتی کنایوں کی صورت میں جذبات کی انگیختگی میں معاون ثابت ہوتے ہیں اور ظاہر ہے کہ معنی، جذبات یا دوسرے لفظوں میں Onomatopoeia کی ترکیبی شدت سے اپنا سراغ دیتے ہیں۔/ کم از کم میں تو اسی طور شعر فہمی کو بہتر اور معیاری سمجھتا ہوں۔

نعیم رضا بھٹی کی شعری اسلوب میں معنی کی توجیہات اور تشکیلات اس کی اپنی وضع کردہ ہیں اور علائم کا انسلاک ظاہری/ باطنی سطح پر بھی یکسر مختلف ڈھب کا ہے یعنی بالفرض آپ نعیم کی کسی علامت کو اگر ظاہری ربط کی رو سے اعتبار بخش نہ بھی پائیں تو باطنی سطح پر اس کا ضرور ایک انضباطی ڈھانچہ متشکل ہوتا ہوا نظر آئے گا۔

شیشے نے انگڑائی لی

اور خود سے دوچار ہوا

یہ شعر خالصتاً اس امر کی طرف اشارہ ہے جس کا ذکر درج بالا سطور میں کیا گیا ہے۔ میرے خیال

سے شعر کا محض بلیغ منظر نامہ متشکل کرنا ہی کافی ہے آپ جزوی انسلاکات کو اگر حذف بھی کر دیں تو تخیل کے براق پر کاٹھی ڈال کر ان دیکھی دنیاؤں کو ہو لینا دشوار نہیں۔ اول تو شیشے کا انگڑائی لینا/ یاد رہے کہ یہاں لفظ شیشہ دو موجودات کا کنایہ ہے۔ آئینے جیسے واضح تر لفظ کے محل کے باوصف شیشہ برتنا اور پھر اس کی انگڑائی سے ایک یکسر مختلف اور الگ وجود متشکل کرنا کہ انگڑائی کے تمام مرئی لوازمات ایک ذی روح سے منسوب ہیں اور اشارہ چونکہ سراپے کی طرف ہے سو یہ سمجھنا آسان ہو گیا کہ وہ سراپا فی نفسہ شیشہ ہے اور شیشہ، شیشے کے روبرو ہو تو انعکاس کی سمت کے تعین کا ایک نیا باب کھل جاتا ہے کہ آئینے میں آئینہ تو بہر حال نظر آتا ہی نہیں۔۔۔ پھر شیشہ اگر ایک شفاف/ ٹرانسپیرنٹ کاربونیٹ کو سمجھا جائے تب بھی سراپے کا شفافیت کی رو سے شیشے کے مماثل ٹھہرنا کیسا نادر اور اچھوتا خیال ہے۔

یہ نعیم رضا بھٹی ہے.......!!

کورا ہونے سے پیشتر میں نے
ایک اک رنگ اختیار کیا

یہ ایسا شعر ہے جس کے ظاہری خدوخال، اعضاء و جوارح بھی صحیح سلامت، خوش طبع ہیں اور باطنی سطح پر اس میں معنی کی تکثیریت کا ظہور بھی ہو رہا ہے۔ ظاہری خدوخال سے ظاہر ہے میری مراد وہ اسلوب ہی ہے جس کا میں ابتدائیے میں ذکر کر چکا ہوں۔ اب اگر اسلوب ہی کی ذیل میں نیا شعری محاورہ وجود میں آ جائے تو کیا اس سے صرفِ نظر کیا جا سکتا ہے؟ ہرگز نہیں کیوں کہ شعری محاورے کے رائج ہونے اور مضبوط جڑ پکڑنے میں بھی روزمرہ کے محاورے جیسی مشکلات کا سامنا رہتا ہے اور برسوں ارتقائی مراحل طے کرنے کے بعد اسے شعری روایت کا حصہ قرار دیا جاتا ہے۔ اب "رنگ اختیار کرنا" ایک شعری محاورہ ہے جو روزمرہ کے نواح سے ہی اٹھا ہے، لیکن اس میں ایک کسب یہ ہے کہ اختیار کرنا کنایہ بن گیا ہے اور اس کنائے کی رو سے یہ ثابت ہو رہا ہے کہ جبریت سے مراجعت کا راستہ کھلتا ہے یا لفظ "اختیار" فی نفسہ جبریت کا ہی استعارہ ہے اور ظاہر ہے کہ اختیار کرنے سے پہلے بھی شاعر کورا ہی تھا سو اسے مراجعت سے موسوم کرنا کیسے مناسب اور کثیر الجہت منظر نامے پر منتج کرتا ہے۔

سب سے پہلے دنیا میں
پسلی کی تنظیم ہوئی

پسلی ظاہر ہے عورت کا کنایہ ہے لیکن یہاں مکمل استعارہ بن گیا ہے اور صد شکر کے نعیم نے یہاں بھی پسلی کی توصیفی ترکیب استعمال نہیں کی وگرنہ شعر یک رخا اور ریاضی کا کلیہ بن جاتا۔ لائق توجہ امر یہ ہے کہ "سب سے پہلے" کا محل کس معنی کی طرف اشارہ کر رہا ہے؟ کیا یہ طے شدہ امر تھا کہ دنیا میں سب سے پہلے جو عمل سرانجام دیا جائے گا وہ عورت کی تعظیم ہوگا یا ایک الگ زاویہ یہ بھی کہ دیگر سیاروں سیارچوں کے مقابلے میں بلکہ آسمانوں کے مقابلے میں بھی سب سے پہلے دنیا" جو یہاں زمین ہی کا کنایہ ہے" وہ منطقہ ہے جہاں عورت کی تعظیم ہوئی اور مزے کی بات یہ ہے کہ پسلی اگر کنایہ یا استعارہ نہ سمجھا جائے تو ایک الگ ہی معنی ظہور کرتا ہے۔۔۔سو یہی وہ کثیر المعنویت وہ Ambiguity اور وہ Plurisignation ہے، جس کا میں اکثر ذکر کرتا رہتا ہوں کہ اردو شعرا کو اس طرف توجہ دینے اور اسی خصوص میں تلازموں کی اجنبیت De-familiarization of Metaphor پر غور کرنے کی بہت ضرورت ہے۔

خالی دامن والوں میں
بے سمتی تقسیم ہوئی
ان چہروں کو آگ لگاؤ
جو انجمن کی کنجی ہیں

اس شعر میں کنجی چونکہ واحد ہے اور چہروں کے سبب کنجیوں کے محل کا گمان بھی گزرتا ہے لیکن استادی یہ ہے کہ کنجی کو مکمل استعارہ بنا دیا گیا ہے اور اب کنجی محض ایک لفظ نہیں بلکہ اپنے بطن سے راحت اور طمانیت کی ہویدگی اور "باز" ہونے کے تمام لوازمات کو جنم دے رہا ہے۔

مرا بے خودی سے
قبیلے کا سردار

اس شعر کو Cosmic irony کی بہترین مثال کہا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا۔

کبھی راس آئے
یہ مانوس دیوار

راس آنے کے تمام تر پہلوؤں کی طرف توجہ کیجیے اور اب شعر میں ایک لفظ مانوس پر فوکس کر کے شعر کا خمیر تلاش کیجیے۔ یقین کیجیے اس شعر میں بہت کچھ ہے جسے بیان کیا جا سکے جیسے انسیت کا راس نہ آنا

اور راس آنے والی دیوار کا مانوس نہ ہونا اور مانوس دیوار کے راس آنے کی ضرورت کا محرک وغیرہ وغیرہ ہم ....چھ الفاظ پر مبنی شعر اور بے شمار سوالات اور بے شمار جوابات۔

کوئی شاخ تنہا
کوئی پیڑ بیمار

Epithet کی ایک نئی جہت ایک نیا ڈھب جسے شاید پہلے کسی نے نہیں برتا۔ پیڑ کا بیمار ہونا ایک ایسی صفت ہے جو ایک جدید تر حسیت کی طرف اشارہ کر رہی ہے۔

اجلی مسہریوں میں پڑی نیند مر گئی
سورج کھلا تو اس کو اجازت بنا دیا

مجھے ذاتی طور پر شعر میں بولڈ اظہاریے کی جگہ کنایہ برتنے میں زیادہ لطف آتا ہے اور چونکہ یہ نعیم رضا بھٹی کی شاعری کا تجزیہ ہے اور اس میں میرا ذاتی ادبی ذوق شامل حال نہیں لیکن یہ کنایہ دیکھ کر میں نے اپنے ادبی مذاق کے لطف کا بھی سامان کر لیا۔۔۔Euphemism انگریزی تنقیدات میں ایک مزے کی اصطلاح ہے اور اس کی رو سے کھلے بندوں اظہار کی بجائے کسی نعم البدل کو استعمال کر لیا جاتا ہے تا کہ بولڈنیس کم ہو سکے اس شعر میں وہی تکنیک استعمال ہوئی ہے اور لفظ "اجازت" میں اس معنی کا جوہر بھی پوشیدہ ہے جس کی طرف میرا اشارہ ہے۔

ہمیں دستک کی عادت ہی نہیں ہے
پلٹ آئیں گے اچھے دن ہمارے

عجب طرح کی بے نیازی ہے جو بہر حال "ایقان" ہی کی مرہون ہے۔

آنسوں نے دھوپ کو میرے مقابل کر دیا
اب دیے کے پاس ہوں اور خیر سے سیراب ہوں

آئینے کے ساتھ چراغ / دیے کے تلازمے کا محل یقیناً نئے صوری منظر نامے کا سراغ دے رہا ہے اور عکس، جمال وغیرہ کے کلیشے سے کلیتاً پاک یہ شعر سیرابی ہونے کے نئے جوازات فراہم کر رہا ہے۔ خیر سے اس شعر میں "سراب" کا کنایہ بھی موجود ہے اور مزے کی بات یہ ہے کہ یہ کریٹو گیپ / تخلیقی حذف کی ذیل میں خود بخود آ گیا ہے۔ آئینے کے ساتھ سراب، سیراب، چراغ کے یکسر مختلف تلازمے تک

بند شاعر کے بس کی بات ہی نہیں۔ یہ تخیل بڑے پیمانے کا کھیل ہے لیکن بہر حال ایک سلیقہ مند اور مہذب سے مزین اظہار یہ اسی صورت ظہور پاتا ہے جب تخیل کو مدارج اور مراتب کا خوب ادراک حاصل ہو جائے اور نعیم کا تخیل ان مراتب و مدارج پر کاٹھی ڈال چکا ہے یہی اس کی کامیابی ہے۔

دریا جب ناشاد ہوا

مشکیزہ ایجاد ہوا

اب دیکھیے کس قرینے سے نعیم نے دریا کی ناراضی، ناخوشی کے سبب مشکیزے کی ایجاد کا مدعا اٹھایا ہے اب سوال یہ ہے کہ دریا کی ناخوشی کیوں کر ممکن تھی اور مشکیزے کی ایجاد سے پیشتر دریا کا مصرف کیا تھا اور وہ کون سے ذرائع تھے جن سے دریا کے پانی کی نقل و حمل طے تھی پھر مشکیزہ ایجاد ہونے کے بعد آیا دریا کے ایجاب اور اجازت کا مسئلہ درپیش آیا یا نہیں؟ یعنی بیسیوں سوالات ایک ہی شعر کے بطن سے ہویدا ہو رہے ہیں۔۔۔لیکن توقف فرمائیے: یہ سوالات شعری ڈسکورس کے بطن سے پیدا ہوئے ہیں اور ظاہر ہے کہ شعر اور تخیل اپنی تاریخ اور واقعات کا انضباط خود طے کرتا ہے۔

کچھ مزید اشعار پڑھیے اور حظ اٹھائیے :

کسی ماہر کھلاڑی کی طرح ہم

ہرے میدان کی خشکی رہے ہیں

میں روشنی کے بیج بو کے سو گیا

چراغ اُگ رہے ہیں کشت خواب سے

پرچھائی پڑ جانے سے

رنگ اڑتا ہے رنگوں کا

بجھ چکے ہیں چراغ اندر سے

اس میں سورج کا کوئی ہاتھ نہیں

مٹکے بھر جانے کے بعد

کیا بنتا ہے موجوں کا

شکر ہے رات اُس ستمگر کا

حسن تھوڑا سا کم لگا مجھ کو

سب سے عمدہ پھول ہو تم

دنیا کے گلدستے میں

لوگ جنت میں جا رہے ہوں گے

اور ہم سٹپٹا رہے ہوں گے

خود بھی معکوس ہونے لگتا ہوں

اتنا تجھ کو سنوارتا ہوں میں

تجھ کو معلوم ہے کہ تیرے بعد

کون سا شخص کس وبال میں ہے؟

ادبی منظر نامے پر بحیثیت دوست اور ہم رکاب نعیم سے زیادہ مہربان اور پرخلوص میں نے کسی کو نہیں پایا۔ یہ بہت اہم بات ہے کہ وہ مشرقین سے مغربین تک اردو کے ہر شاعر کے کلام، طبع اور وضع سے مکمل آگاہ ہے۔ ہمہ وقت اور ہمہ جہت شاعر، میں نے اسے ہر حال میں شاعر پایا ہے۔ "ایقان" کی اشاعت یقیناً نئے تلازموں کی پیکر تراشی میں اہم سنگِ میل ثابت ہوگی۔

ربِ ذوالجلال کی بارگاہِ صمدیت میں دعا گو ہوں کہ نعیم رضا بھٹی کے تخیل اور فن کی خرجین قیمتی جواہرات سے بھری رہے اور وہ یوں ہی اوپر ہی اوپر اڑتا رہے۔

فرزاد علی زیرک

شارجہ، متحدہ عرب امارات

خداوند جل جلالہ کے حضور!

اے ربِ تقدس
تری تقدیس کے مارے
سجدے میں رگڑتے ہیں جبینوں کے ستارے
سیارۂ تقدیر سفر کھینچ رہا ہے
لاوقت، تدبر سے اثر کھینچ رہا ہے
کس حال میں ہم عقدہ کشاں دیکھ رہے ہیں
تجھ بھید کا کھلنا بھی تو ہے کھلنا ہمارا
اے سرِ زماں
لفظ کی توقیر کے صدقے
تاثیر بس اک نکتۂ ملفوف سے نکلے
اور طُور کے اس پار تجلّی کی نمو ہو

۞۞۞

ختم المرسلینؐ کے حضور!

نظامِ کن میں ارتقا ضروری ہے
ترا کرم تری رضا ضروری ہے

میں اپنی خاک آنسوؤں میں گوندھ لوں
کہ اک سبیلِ کیمیا ضروری ہے

فصاحتوں کی حبس میں پڑا ہوں میں
مجھے حجاز کی ہوا ضروری ہے

جو بامراد اشک ہیں سمیٹ لوں
سفر میں ہوں سو آسرا ضروری ہے

وہ سامنے ہوں اور نظر ہٹے نہیں
فقیر کو بس اک دعا ضروری ہے

امامؑ عالی مقام کے حضور!

اُن سا بیدار نظر، نورِ ظلمات کہاں
جز حسینؑ ابنِ علیؑ کشف و کرامات کہاں

تا ابد لکھا رہے گا لبِ دریائے فرات
کوفۂ مرگ کہاں عزتِ سادات کہاں

دیکھ لو کتنا تفرق ہے مقابل اِن کے
خوگرِ ظلم کہاں عشقِ مہمات کہاں

مدحتِ آلِ رسولِ عربی کیسے ہو
لغتِ عالمِ فانی کی یہ اوقات کہاں

تا ابد سر بہ گریبان رہوں گا لیکن
اُن کے احوال سے بڑھ کر میرے صدمات کہاں
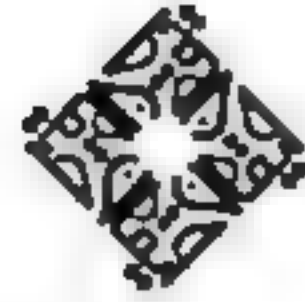
کون کہتا ہے تمہارے واسطے بیتاب ہوں
زندگی سرسبز ہے اور میں بہت شاداب ہوں

روشنی کی اک کرن مجھ پر پڑی تو خود کو میں
غور سے دیکھا تو جانا میں بھی کچھ نایاب ہوں

مجھ میں در آیا تھا کچھ تو اپنی بینائی کا زعم
اور یہ بھی لگ رہا تھا میں تمہارا خواب ہوں

عارضہ لاحق ہوا تو سانس لے کر خوش ہوا
سانس لیتا تھا تو یہ لگتا تھا میں کمیاب ہوں

آنسوؤں نے دھوپ کو میرے مقابل کر دیا
اب دیے کے پاس ہوں اور خیر سے سیراب ہوں
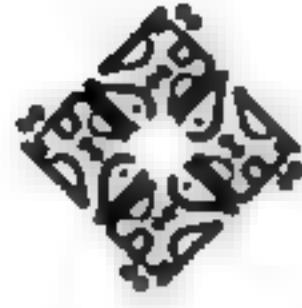
وہ تشنگی جسے صحرا کا نام بھول گیا
ملی مجھے تو میں اپنی لگام بھول گیا

اسے عزیز ہے نام و نمود وہ خوش ہے
میں جس کے واسطے اپنا مقام بھول گیا

دیے کی لو مری سانسیں بحال رکھتی تھی
اسیر ہو کے مجھے انہزام بھول گیا

خوشی ہوئی کہ اسے غم بھی راس آیا نہیں
خوشی ہوئی کہ وہ مجھ کو مدام بھول گیا

جلے ہوئے میں نہیں جذب کی سکت سورضا
جراحتوں کے سبھی اہتمام بھول گیا
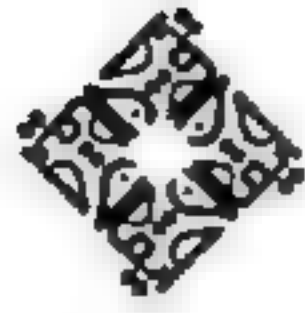
خواب اور عشق کے اثر سے نکل
کر نہ تاخیر چشمِ تر سے نکل

پیڑ کو چھوڑ اپنی چھاؤں بنا
کام مشکل نہیں تو ڈر سے نکل

دیکھتا کیا ہے؟ یہ پھٹا کرتا؟
بھاگ یوسف تو اس شرر سے نکل

جس کو ماں باپ کا خیال نہیں
پھینک کر تھوک اس کے گھر سے نکل

تیرے آنسو ہی تیرا زیور ہیں
قدر کر لے رضا مفر سے نکل
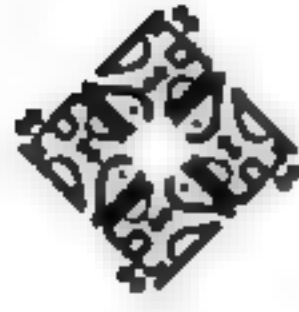
چھلکتی شب میں سسکتا ہوا الاپ سنو!
اک اعتبار گزیدہ قدم کی چاپ سنو!

وہ شہسوار بچھڑ کر بھی جا چکا ہوگا
اب انتظار سمیٹو!، دھوئیں کی ٹاپ سنو!

یہ مرحلہ ہے فقط عشق کے مریضوں کا
تم ابتدائی اداسی سے جھڑتی تھاپ سنو!

سخن ہے رزق سے مجھے بھی ملا مرا حصہ
مرے کہے پہ کسی کی نہیں ہے چھاپ۔۔ سنو!

میں اس کے سائے میں رہ کر بڑا ہوا ہوں رضا
مرے لیے گلِ احمر ہے میرا باپ سنو!

* عقیل عباس کے نام
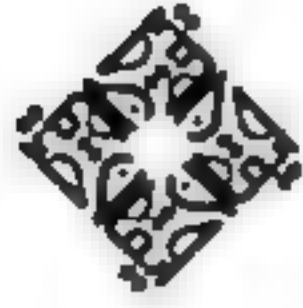
کہانی میرے بھائی مختصر ہے
یہ دنیا انتہائی مختصر ہے

سر کنا مسئلہ ہے پتھروں کا
مگر یہ خودنمائی مختصر ہے

گھڑی بھی کٹ نہیں پاتی تھی مجھ سے
وہ کہتی تھی جدائی مختصر ہے

کرایہ دار ہوں میں بھی یہاں کا
تعارف ابتدائی مختصر ہے

سکوں کا پل نہیں ملتا رضا کو
کہاں یہ جگ ہنسائی مختصر ہے
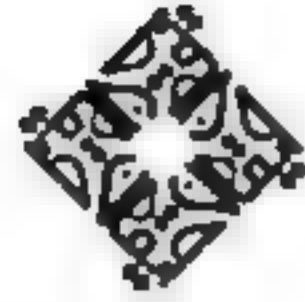
نمو پذیر ہیں، آنکھوں میں جھلملاتے ہیں
وہ خد و خال مجھے آج بھی ستاتے ہیں

کبھی فضول دلائل سے ہانکتے ہیں مجھے
ترے نقوش کبھی مجھ پہ کھلکھلاتے ہیں

اُسے کہو کہ اٹھائے لوؤں کے ملبے کو
چراغ اب تہہ دیوار تلملاتے ہیں

جنہیں رہائی کی کوئی خبر نہیں ملتی
وہ شام ہونے سے پہلے ہی ٹوٹ جاتے ہیں

انہیں قبول نہیں ہے جدید عہد رضا
جو رفتگاں کی روش پا کے ٹپٹاتے ہیں

دو قدموں پر منزل پائی
اور پھر میں نے ٹھوکر کھائی

اسی لیے ہوں از بر اس کو
عُسرت ہے اپنی ماں جائی

جیب بھری رہتی تھی پھر بھی
ہر خواہش کی ہنسی اڑائی

میں اور گوتم مل بیٹھیں تو
چیختی ہے ہم پر تنہائی

شعر اور شر میں فرق ہے اتنا
جیسے دھوپ میں ہو پروائی

جب میں تھک کر گر جاتا ہوں
کہاں چلے جاتے ہو بھائی
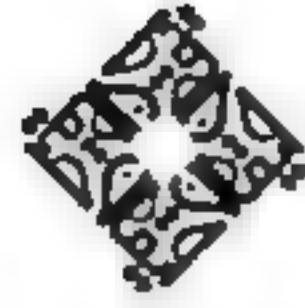
تو نے جہاں زمین کو اک نقشِ پا دیا
ایڑی گھما کے میں نے وہ منظر گھما دیا

اجلی مسہریوں میں پڑی نیند مر گئی
سورج کھلا تو اس کو اجازت بنا دیا

اپنا چراغ اپنی طرف موڑ لائے ہم
ہم نے بھی آ بجو کے اندھیرے کو کیا دیا؟

لکھا تھا نام اس پہ اگر ماہتاب کا
وہ تیر پھر جناب نے کیسے چلا دیا

رو دوں تو زخم زخم سے گریہ نکل پڑے
اچھا کیا جو تو نے مجھے بھی ہنسا دیا
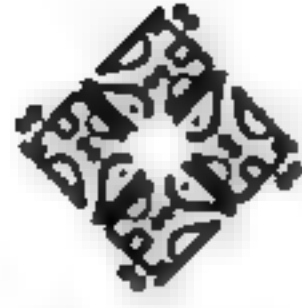
کچھ بھی نہیں ملا مجھے
پھر بھی نہیں گلہ مجھے

کیسا عجیب عہد ہے
کیسی ملی سزا مجھے

سیدھے سبھاؤ بات کر
انگلی نہیں دکھا مجھے

تیرے بغیر صفر تھا
تو نے کیا ادا مجھے

مجھ پہ نہ کھل سکا رضا
چاہیے کون کیا مجھے

209
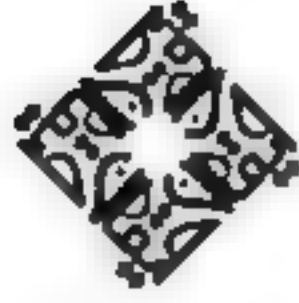
عشق میں جب سے مبتلا ہوں میں
عام سے خاص ہو گیا ہوں میں

سانس بے ربط ہو تو لگتا ہے
جلتا بجھتا ہوا دیا ہوں میں

کئی دریا مرے ہیں آنکھوں میں
یوں نہیں زرد پڑ رہا ہوں میں

کچھ نہتا ہوں اور کچھ تنہا
اس لیے سوگوار سا ہوں میں

لب کشائی کا اذن دیتا ہوں
کوئی پل رک ذرا، رضا ہوں میں

سب کہہ رہے تھے، آپ کٹیلی چٹان ہیں
پھر یوں لگا کہ ہم تو ہوا کا گمان ہیں

وارفتگی کا بوجھ کبھی اٹھ نہیں سکا
اور ناز ہے کہ ہم تو ابھی نوجوان ہیں

ڈھونڈے سے مل نہ پائے گی ہم کو زباں یہاں
جس سمت دیکھتے ہیں ادھر صرف کان ہیں

عباس ہیں مثال وفا کی اسی لیے
دریا کنارے اب بھی وفا کے نشان ہیں

نقشہ کسی خزانے کا ہوگا تمہارے پاس
رستے میں جس کے سوئے ہوئے خاندان ہیں
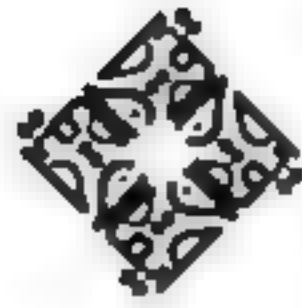
ڈر رہا تھا، مجھے لگا میں ہوں
اور پھر اس نے کہہ دیا.... میں ہوں

ایک دن میں نے عشق کو جکڑا
ایک دن خواب نے کہا میں ہوں

داستاں سن سنا کے لوٹ گئے
وہ پتنگے جنہیں دیا میں ہوں

جو مجھے چاہتے ہیں چاہتے ہیں
ہر کسی کو کہاں روا میں ہوں

مجھ کو لاحق ہے آگ لے آؤ
چونکہ شعلے کا مسئلہ میں ہوں
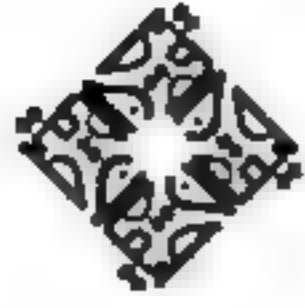
دھوپ سمیٹی کاسے میں
خواب جڑے دروازے میں

آنکھ بھری آوازوں سے
ہونٹ جھلے سناٹے میں

لاٹ نہیں کرلاٹ ہے یہ
کھوٹ بھرے اس جھمکے میں

بے گھر کو معلوم نہیں
کتنے شہر ہیں نقشے میں

اور بھی میٹھی لگتی ہو
ڈانٹتی ہو جب غصے میں

سب سے عمدہ پھول ہو تم
دنیا کے گلدستے میں

خرد شعارِ زمانہ اور احتسابِ جنوں
سو اب یہ بند ہی رکھیں گے ہم کتابِ جنوں

مشابہت کے لیے سیم و زر تلاش کریں
یہ سنگِ در ہے یہاں پر نہیں حجابِ جنوں

تمہارے ہوگا مگر یہ ہمارے بس میں نہیں
نوائے عشق کی لے میں ہو اجتنابِ جنوں

وہی نظر وہی در ہے مگر تپش کم ہے
تو کیا یہیں سے پلٹ جائے گا سحابِ جنوں

ترے حضور جھکی تھی ہوائے شام و سحر
تری رضا سے کھلا فتنہ سازِ بابِ جنوں

کچھ تو حیرت سے دیکھتے ہیں مجھے
کچھ عداوت سے دیکھتے ہیں مجھے

دل کا آزار اور بیزاری
کتنی حجت سے دیکھتے ہیں مجھے

پھول رہتے ہیں جستجو میں مری
یعنی منت سے دیکھتے ہیں مجھے

ان کو کیسے کروں نظر انداز
وہ عقیدت سے دیکھتے ہیں مجھے

ایسے لوگوں کی خیر ہو مولا
جو محبت سے دیکھتے ہیں مجھے

209

سیاہ برف، چٹختا دھواں، تماشا ہوا
دھڑک رہا ہے دلِ ناتواں، تماشا ہوا

امام ہیں وہ منافق صفوں کے یاد رہے
کہ جن کے سامنے وہ بے کراں تماشا ہوا

ہمیں تلاش ہے چھت کی، کوئی نظر میں ہے؟
ہمارے واسطے یہ سائباں تماشا ہوا

وہ اپسرا جسے شور و شرر پسند نہیں
وہاں کھڑی تھی جہاں رائگاں تماشا ہوا

پھر ایک روز یہ عقدہ کھلا رضاؔ ہم پر
کہاں سے رات گری اور کہاں تماشا ہوا
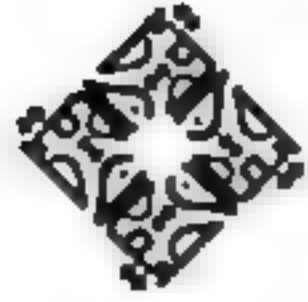
کرتے رہو دعا ابھی
اترا نہیں صلہ ابھی

نعرہ لگاؤ فتح کا
ٹوٹے گا بت کدہ ابھی

دنیا کی سیر کو چلیں
خود سے نکل کے آ ابھی

بدلیں معاملات کو
رہنا ہے یا برا ابھی

جلنا مرا نصیب ہے
جلتا رہے دیا ابھی

زندہ دلانِ شہر میں
ہو گا کوئی خدا ابھی؟

خود ہی کیا ہے فیصلہ
مانگی نہیں رضا ابھی

❁❁❁

سبھی سے اپنے تئیں رسم و راہ رکھتی ہے
سے کی آنکھ شریعت کی پاسدار نہیں

109

شاخِ نو پر بور آنے کی خوشی
بھا گئی مجھ کو زمانے کی خوشی

داستاں میں قہقہہ دانستہ تھا
یوں منائی ہار جانے کی خوشی

باپ کا چہرہ دمکتا دیکھ لو
ایسی ہوتی ہے کمانے کی خوشی

ابر برساتی ہوئی آنکھوں کی خیر
خواب پانی میں بہانے کی خوشی

مورکھوں کو کس طرح محسوس ہو
راگ بھیرو گنگنانے کی خوشی

پھسلی جب ہو کے مسترد آئی
تب کہیں دوسری سند آئی

ہم بھی بہروپ دھار بیٹھے تھے
اس قدر بے ضرر مدد آئی

نیند میں چل رہا تھا آوارہ
بت کدہ آ گیا تو حد آئی

کس درندے کے دانت گڑتے ہیں
کن مچانوں پلی رسد آئی

آنکھ میں ایک سرخ ڈورا ہے
خواب میں ایک شکل بد آئی

پیالے بھر کے غم جو پی رہے ہیں
بہت اندر کے گھاؤ سی رہے ہیں

تمہارے مخملیں گالوں کے صدقے
ہم اپنی خستگی بھی جی رہے ہیں

ہمیں دنیا کے ملنے پر خبر ہو
کہ کچھ دن ہم تمہارے بھی رہے ہیں

کسی ماہر کھلاڑی کی طرح ہم
ہرے میدان کی خشکی رہے ہیں

کہاں تجھ قیس کی محنت پڑی ہے؟
اگر ہم ہوش میں وحشی رہے ہیں

دلِ درویش کی دعا سے اٹھا
یہ ہیولیٰ سا جو ہوا سے اٹھا

نشۂ خواب بعد میں اترا
پہلے خوشنودئ ولا سے اٹھا

شہرِ سرمست میں شفق اتری
اور منظر کوئی ورا سے اٹھا

اس کو میں انقلاب کہتا ہوں
یہ جو انکار کی فضا سے اٹھا

وہ بھروسا ہوا غریقِ دشت
جو تمہاری ہر اک رضا سے اٹھا

کون کہتا ہے کہ پانی کے سبب زندہ ہیں
ہم تو بس جلتی کہانی کے سبب زندہ ہیں

یہ جراحت ہی ہمیں سبز کیے رکھتی ہے
زخم سے خوں کی روانی کے سبب زندہ ہیں

تم بھی کچھ دیر بڑھاپے کی طرف ہو لینا
ہم بھی کچھ دیر جوانی کے سبب زندہ ہیں

ہنسنے لگتے ہیں تو ہر سانس اکھڑ جاتا ہے
یعنی ہم غم کی روانی کے سبب زندہ ہیں

چھاؤں اور پھل کی تمنا میں مری جاتی ہے
باغ جس رات کی رانی کے سبب زندہ ہیں
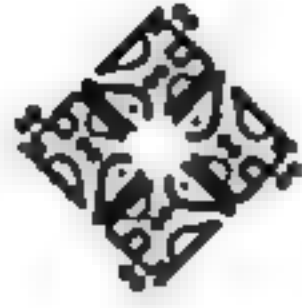
ایسے ملفوف ہے جھلک اُس کی
مجھ پہ کھلتی نہیں مہک اُس کی

یہ ضروری نہیں شرر ہی ہو
عین ممکن ہے ہو چمک اُس کی

بیٹھے بیٹھے خیال ٹوٹ گیا
اور جبکڑاتی گئی کھنک اُس کی

اُس ہنسی کے لیے تڑپتا ہوں
کن اندھیروں میں ہے دھنک اس کی

مرنے والے کو کون بتلائے
خون کا اشک ہے کسک اُس کی
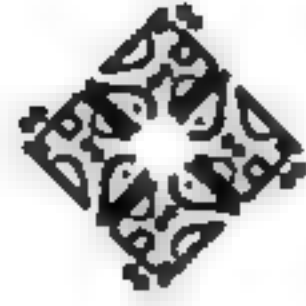
درندوں کو تو ڈر کوئی نہیں ہے
یہاں یوں بھی بشر کوئی نہیں ہے

سفر درپیش ہے تو رنج کاٹیں
ابھی تو رہگزر کوئی نہیں ہے

اگلتا پھر رہا ہے آگ وحشی
مگر اندر شرر کوئی نہیں ہے

یہ ستے اینٹ گارے کے ہیں رشتے
مکاں ہے دوست گھر کوئی نہیں ہے

میں دستک دینے والوں پر ہنسوں گا
مجھے لگتا ہے در کوئی نہیں ہے

ہمیں بھی دربدر ہونا پڑے گا
تمہارا بھی نگر کوئی نہیں ہے

ترے کردار تجھ پر ہنس رہے ہیں
کہانی معتبر کوئی نہیں ہے

٭٭٭

آج تک بج رہا ہے دروازہ
خواب تو کھٹکھٹا کے لوٹ گیا
اس کو سونپی گئی تھی سرداری
اور وہ سر کٹا کے لوٹ گیا

کوئی پل جی اٹھے اگر ہم بھی
دم نہ لے پائے گا ترا دم بھی

کیا مرے بس میں کچھ نہیں رکھا
غیب سے آئے گا اگر نم بھی

ان لبوں کی کرشمہ سازی دیکھ
شہد لگنے لگا مجھے سم بھی

اپنی بے اعتنائیوں کے سبب
میں اگر بڑھ گیا ہوا کم بھی

بے بسی میں پکار بیٹھا تھا
مجھ پہ ہنسنے لگا ترا غم بھی
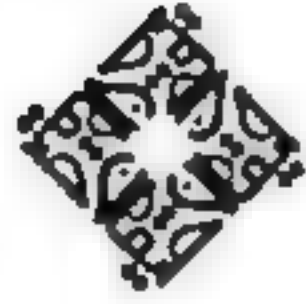
ہے تلخ تر حیات، اس شراب سے
میں عشق ہار دوں گا اجتناب سے

کہانیاں دہک رہی ہیں رات کی
بدن الجھ رہے ہیں ماہتاب سے

میں روشنی کے بیج بو کے سو گیا
چراغ اگ رہے ہیں کشتِ خواب سے

رفو گرو! ہم ایسے خستہ تن یہاں
ادھڑ ادھڑ کے آئیں گے سراب سے

خدائے خواب خیمہ زن تھا آنکھ میں
سو دل چیخ رہا تھا اضطراب سے

رضاؔ یہ خوشبوؤں کا ذائقہ نہیں
جو رس رہا ہے جسم کے گلاب سے

اپنی تنہائی کے حصار میں ہے
موت خلقت کے انتظار میں ہے

ایک تو ہے شدید ویرانی
اور کیا کیا مرے غبار میں ہے؟

ان دنوں نیند کا درندہ بھی
میری آنکھوں کے اختیار میں ہے

بدگمانی کو کچھ خبر ہی نہیں
کیسی تسکین اعتبار میں ہے

کم نہیں ہے سخن کی کم کوشی
ساری وسعت ہی اختصار میں ہے
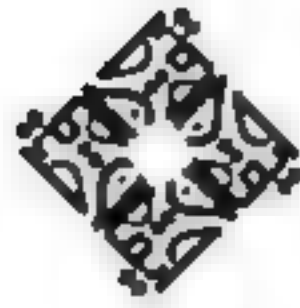
خرد کا رستہ جنوں کے چلن سے ملتا ہے
دہن کا ذائقہ، رنگِ دہن سے ملتا ہے

بس اتنا جانیے ہم ایسے راست بازوں کا
ضرور سلسلہ دار و رسن سے ملتا ہے

دیارِ کوفہ کے باسی تمہاری جد سے ہیں
نسب تمہارا عدو کے وطن سے ملتا ہے

جو اندرون بپا ہے وہی برون بھی ہے
فضا کا حبس بھی دل کی گھٹن سے ملتا ہے

ہمیں خود اپنے معانی کی کچھ خبر ہی نہیں
اگرچہ ربط ہمارا سخن سے ملتا ہے

بات یہ ہے کہ کوئی بات نہیں
اب زباں بھی ہمارے ساتھ نہیں

ایک حد میں رکھا گیا ہے ہمیں
اور حد سے کوئی نجات نہیں

اب سہولت پہ ہی قناعت ہے
ورنہ ذرے میں کائنات نہیں

بجھ چکے ہیں چراغ اندر سے
اس میں سورج کا کوئی ہاتھ نہیں

خوف آئے تو کھانس لیتا ہوں
یہ دفاعی عمل ہے مات نہیں
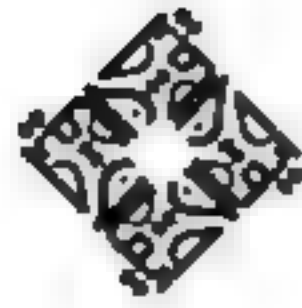
مستقبل سے پھسلی ہیں
''کاشیں'' اس کی جلتی ہیں

دہرا کر افسوس ہوا
اس کی نظریں خبطی ہیں

ان چہروں کو آگ لگاؤ
جو الجھن کی کنجی ہیں

بچ جاؤ گے ذلت سے
اس کے گھر میں پنچھی ہیں

دیکھو بے آہٹ آوازیں
کیکر کی ہمسائی ہیں
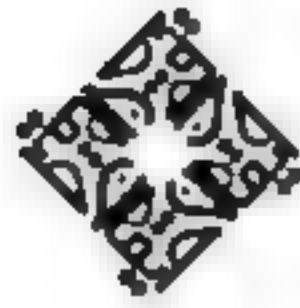
نیند جب خواب کے اعصاب پہ دم کرتی ہے
ذہن کھل جاتا ہے اور دل کو گرہ لگتی ہے

اک صدا کھینچ کے کشکول الٹ دیتا ہوں
اور خیرات کسی سمت سے چل پڑتی ہے

گرد ہوتے ہوئے لمحوں کی شکستہ بختی
بد دماغی میں ہواؤں کی مدد کرتی ہے

میں جہاں سرخ پرندوں میں گھرا رہتا تھا
اب وہاں پختہ مکانوں کی تھکن اڑتی ہے

پیاس کھلتی ہوئی دیکھی تھی سرِ شاخ رضا
آج تک سبز نگاہی کی کمی کھلتی ہے

ہجر کا درد میرے حال میں ہے
زخم تو محو ، اندمال میں ہے

کوئی چارہ نہیں ہے وصل بغیر
ضبط کا رنگ اشتعال میں ہے

دیکھ سکنے نے کر دیا ساکت
آنکھ اک جسم کے وبال میں ہے

تجھ کو معلوم ہے کہ تیرے بعد
کون سا شخص کس ملال میں ہے

پہلے تیار ہو چکے ہیں جواب
کچھ کمی تو مرے سوال میں ہے

خواب کی سمت مڑنے والی نظر
اک سڑک جو مرے خیال میں ہے

ایک زحمت ہے اوپر اٹھنا رضاؔ!
کیا سہولت مجھے زوال میں ہے

❁❁❁

ایک مقتول کی گواہی سے
بچ گئے ہم بڑی تباہی سے
انتہائی قدیم ہے دنیا
بوالہوس اور بادشاہی سے
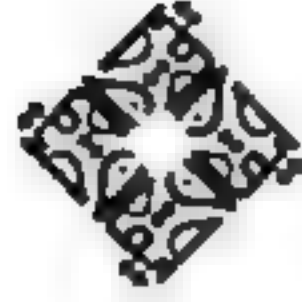
ہم ایسے لوگ جنہیں حبس بھی سہولت ہے
کواڑ بند ہی رکھیں تو کیا قباحت ہے

بدن کی خستگی کہتی رہی مکیں سے کہ آپ
حدوں کو پار نہ کیجے یہی روایت ہے

ہم اپنے خواب اگر اس پہ وار دیتے ہیں
تو اس کا یہ نہیں مطلب وہ خوبصورت ہے

ہزار بار ہمیں وہ سلگ کے ملتا رہے
وہ جانتا ہے ہمیں کس قدر محبت ہے

میں اس کی آگ میں جلتا ہوں میری آگ میں وہ
لہو کا جزیہ اسی طرز کی طریقت ہے
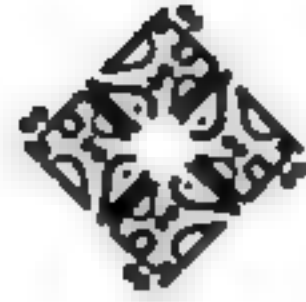
اپنے دامن کا داغ ہوں لڑکی
اس قدر بد دماغ ہوں لڑکی

مجھ سا صحرا ہوا ہے کب سیراب
تشنگی کا ایاغ ہوں لڑکی

تو ثمر ہے مری مشقت کا
میں محبت کا باغ ہوں لڑکی

سارے اسرار ہیں جبیں پہ مری
منکشف سا سراغ ہوں لڑکی

میں دیا ہوں رضا کی تربت کا
جلتا بجھتا چراغ ہوں لڑکی

جس سے للک پڑے گی دل پائمال میں
وہ کہکشاں بسی ہے ترے خد و خال میں

یعنی یہ جسم اپنی کھنک سے کھڑا ہوا
یا اختیارِ آب سے اترا سفال میں

اب گیلی لکڑیوں کا بہانہ فضول ہے
دن بھر سے آگ گھوم رہی ہے جلال میں

وہ رات میری نیند کا قضیہ اٹھا نہ دے
دن کاٹتا ہوں اب میں اسی احتمال میں

خوابیدگی کی تاب ابھاروں گا شعر میں
تیرا جمال اونگھ رہا ہے خیال میں

209

دریا جب ناشاد ہوا
مشکیزہ ایجاد ہوا

یعنی میں خبطی البیلا
بالآخر برباد ہوا

بالوں میں چاندی اتری تو
نام تمہارا یاد ہوا

سبھی دروازوں کا بھیتر
کتنا کم معیاد ہوا

اپنی بے سمتی کا نوحہ
بے ہنگم افتاد ہوا
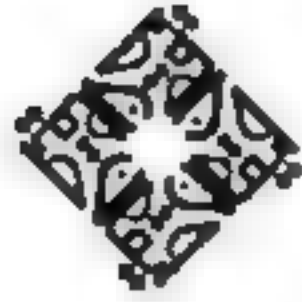
نئی بلائیں جو اڑیل بھی ہیں نڈر بھی ہیں
نہیں ہیں ساتھ پہ اپنی وہ ہمسفر بھی ہیں

عجب نہیں کہ فقیری کے بھیس میں کچھ لوگ
خبر بھی رکھتے ہیں اور خود سے بے خبر بھی ہیں

نوادرات ، یہ سکے سنبھال کر رکھ لو
روایتوں کی علامت ہیں رہ گزر بھی ہیں

کوئی کمک چلی آئے مدافعت کے لیے
عبث یہ سست ہیں لہریں جو تیز تر بھی ہیں

پڑاؤ اپنا وہیں ہے جہاں پہ صدیوں سے
محل کھڑے ہیں رضا پاس کچھ کھنڈر بھی ہیں
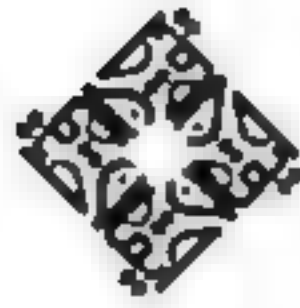
رات پر جان وارتا ہوں میں
رائگاں دن گزارتا ہوں میں

ویسے تو پیڑ سے نہیں بنتی
پھل اگرچہ اتارتا ہوں میں

میرے اعتقاد کے باعث
اپنا کمرہ سنوارتا ہوں میں

خود بھی معکوس ہونے لگتا ہوں
اتنا تجھ کو سنوارتا ہوں میں

گونج اٹھتی ہیں میری شریانیں
اس کو اتنا پکارتا ہوں میں

109

مجھے دانش پہ مائل کیوں کریں گے
توجہ مجھ پہ سائل کیوں کریں گے

یہی ایذا پرستی مسئلہ ہے
بمشکل ہی وہ قائل کیوں کریں گے

جنہیں محتاج رہنا خوش نہیں ہے
وہ اپنا آپ زائل کیوں کریں گے

یہ مجبوری کے مطلب سے شناسا
مرے آگے مسائل کیوں کریں گے؟

شناور جو سمجھتے ہیں رضا کو
سرابوں سے وہ گھائل کیوں کریں گے
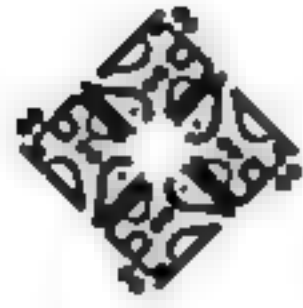
تجھ سے یونہی نہیں کنارا ہوا
میں تھا مجبوریوں کا مارا ہوا

پہلے آیا شکستگی کا ہنر
پھر نمودار اک ستارہ ہوا

اک دیا، دے دیا گیا ہے مجھے
اک دیا سورجوں پہ وارا ہوا

کب سمجھتا تھا میں اشاروں کو
جب مجھے غیب سے اشارا ہوا

سنگ تو دسترس میں تھا ہی نہیں
شکر ہے پھول تو ہمارا ہوا

پھر پہننا پڑے گا کیا مجھ کو
وہ جو ملبوس ہے اتارا ہوا

309

سہمی ہوئی آوازوں کا
جنگل ہے اک یادوں کا

لہجوں سے ڈر جاتے ہیں
مذہب کیا ہے لفظوں کا؟

پرچھائی پڑ جانے سے
رنگ اڑتا ہے رنگوں کا

مٹکے بھر جانے کے بعد
کیا بنتا ہے موجوں کا

لکھا ہے میں نے یہ نوحہ
ٹوٹی پھوٹی چیزوں کا

اوک بھر، آئینے سے گیان لیا
اور خود کو چراغ مان لیا

ورنہ کس کی مجال تھی پوچھے
میں نے خود اپنا امتحان لیا

ہر طرف ہے مبالغہ میرا
میں نے مٹھی میں آسمان لیا

اک پرندے کو پہلے قید کیا
پھر قفس نے مجھے بھی آن لیا

میں نگینے بکھیر دوں گا رضا!
تو نے اپنا مجھے جو مان لیا
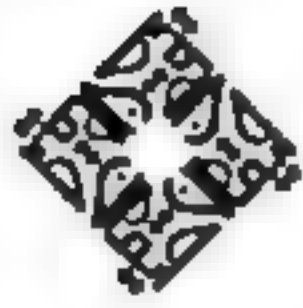
زندگی کی ملی دعا مجھ کو
کیسے گزرے گی یہ بتا مجھ کو

میں تماشا ہوں یا تماشائی
ہے یہ درپیش مسئلہ مجھ کو

واجبی نین نقش ہیں اس کے
پھر بھی میں خوش ہوں وہ ملا مجھ کو

شکر ہے رات اس ستمگر کا
حسن تھوڑا سا کم لگا مجھ کو

اب جوانی کے مخمصے میں ہوں
کتنا بھاتا تھا بچپنا مجھ کو

گونج اٹھے گی خامشی ہر سمت
چاہیے بس تری رضا مجھ کو

تو اگر سامنے سے ہٹ جائے
تو مرا راستہ بھی کٹ جائے

اس سے پہلے کہ خامشی توڑوں
آئینے میں صدا سمٹ جائے

تابِ نظارگی نہیں مجھ میں
حسن سے کیا کہوں پلٹ جائے؟

کیا یہ ہجرت بہت ضروری ہے
یعنی اس دل کا بوجھ گھٹ جائے

دل کا لاوا بجھا چکا ہوں رضا
اب بھلے یہ دماغ پھٹ جائے

209
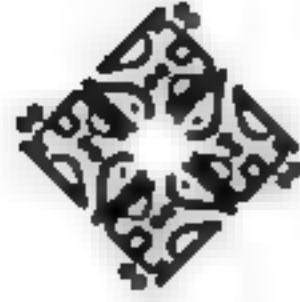
کتنے دل آویز ہوئے
خواب جو کم آمیز ہوئے

لہجوں کو تسخیر کیا
یوں سمجھو خوں ریز ہوئے

کاٹ کے کچھ دن اپنے ساتھ
نشے سے لبریز ہوئے

چلنا بھول گئے تھے قدم
اس نے کہا تو تیز ہوئے

ضدی تھے سو ہم کل شب
غصے سے "مہمیز" ہوئے
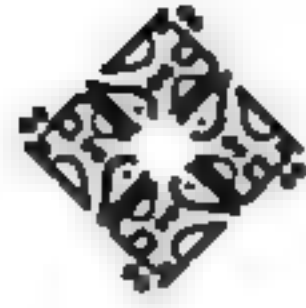
آپ اپنا سراغ پانے سے
رابطہ بڑھ گیا زمانے سے

تم قناعت پہ کار بند رہو
باز آیا میں دل لگانے سے

ہجر کا انتظام بہتر ہے
وصل کا بوریا بچھانے سے

یہ محبت ہے، آگ تھوڑی ہے
یہ نہ بجھ پائے گی بجھانے سے

نازکی ان لبوں کی لیتا ہوں
میں کلاسیکی کارخانے سے

ڈالیاں مجھ پہ طنز کرتی ہیں
منحرف ہوں میں آشیانے سے
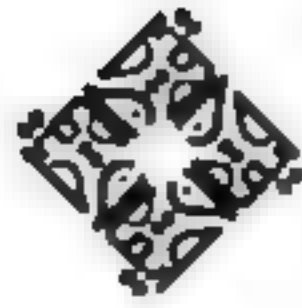
گھنی ہو باڑ تو کلیاں شمار ہوتی نہیں
مزید فائدہ سر پر سوار ہوتی نہیں

وقوعِ مرگ ہمیں لوریاں سنائیں گی
وہ آتمائیں جو گریہ گزار ہوتی نہیں

سپید و احمریں ہوں گی یہ مان لیتا ہوں
سنہری آنکھیں کبھی بیقرار ہوتی نہیں

اگرچہ جہدِ بقا میں یہ شرمسار نہیں
وگرنہ برچھیاں شیشے سے پار ہوتی نہیں

انہی کے زعم پہ میں نے جتن کیے ہیں تمام
کہ جو ادائیں رضا تابکار ہوتی نہیں

ڈھل جائے تو بہتر
ٹل جائے تو بہتر

پہلے تیر ہمارا
چل جائے تو بہتر

اس سے کہو رک جائے
کل جائے تو بہتر

آئینے پر کالک
مل جائے تو بہتر

سائے میں وہ میرے
پل جائے تو بہتر

109

گردن کٹ جائے گی
بل جائے تو بہتر

پیڑ بچے تو اچھا
پھل جائے تو بہتر

✿✿✿

ہوائے تیز نے بارش سے ساز باز کے بعد
بدن کا دشت مری پیاس سے ملا دیا ہے

صعوبت سہہ رہے ہیں جن ہمارے
مگر بے کار ہیں یہ بن ہمارے

ہمیں دستک کی عادت ہی نہیں ہے
پلٹ آئیں گے اچھے دن ہمارے

وہی لمحے قیامت کے لیے ہیں
ہنسیں گے جب کبھی مومن ہمارے

بہت شرمندگی پٹڑی کو ہوگی
اتر جائیں اگر انجن ہمارے

سمے کی گونج گہری ہو گئی ہے
ہوئے مبہم تبھی کم سن ہمارے

بات کرنا اسے روا نہیں تھا
اور مجھ سے جتن ہوا نہیں تھا

سارے منظر ہی دیکھنے کو ملے
اس کی آنکھوں میں بس خدا نہیں تھا

آخرش اس بدن کی بنیادیں
ہل گئیں اور اسے پتہ نہیں تھا

مرنے والے نے صرف اتنا کہا
موت کا کوئی ذائقہ نہیں تھا

رات بھر ایک سطر سیدھی کی
صبح دیکھا تو کچھ بنا نہیں تھا

وہ جراحت بھی شعبدہ تھا کوئی
معجزہ تو ابھی ہوا نہیں تھا

میں دعا مانگتا تو تھا لیکن
تجھ سے کافر کو مانگتا نہیں تھا

اس کو مجھ سے بہت محبت تھی
اور یہ میرا مسئلہ نہیں تھا

✿✿✿

اپاہج ہوتے ہوتے خواب ٹوٹے
یہ خواہش غیر معمولی نہیں ہے

مچانیں ڈھونڈتے ہیں
شکار اب تھک چکے ہیں

خوشی میں سرخوشی ہے
جسے ہم پھانکتے ہیں

سکوں کا پل نہیں ہے
مرے سپنے بڑے ہیں

پلٹ آئے گی وحشت
سو چوکھٹ پر کھڑے ہیں

بہت روتی ہے گڑیا
"پٹولے" کھو گئے ہیں

انہی میں زندگی ہے
مرے جو تجربے ہیں

رضا ! بیگانگی سے
تمہارے رابطے ہیں؟

✿✿✿

کتنے آنسو نگلنا پڑتے ہیں
پتھروں کو گھر بناتے ہوئے
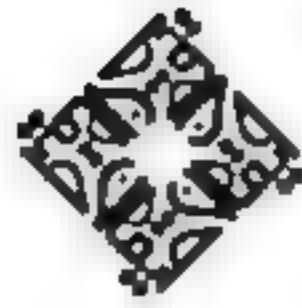
کون کہتا ہے خیر و شر کے لیے
اس نے دنیا بنائی ڈر کے لیے

بے یقینی گماں کھینچتی ہے
یہ سند ہو گی بیشتر کے لیے

آدمی ہے جمالیات کی مثل
سو مناسب ہے رہ گزر کے لیے

دام، صیاد کو کہاں ملتے
اس نے گردن پہ پاؤں دھر کے لیے

نقرئی ہے یہ جامۂ ہستی
میں بدلتا نہیں سفر کے لیے

209
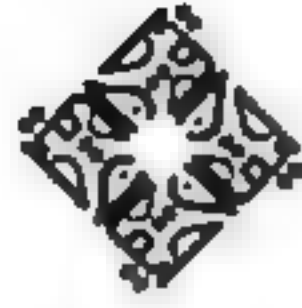
چلنا ہی دشوار ہوا
رستہ جب ہموار ہوا

تجھ معصوم کی صحبت میں
میں کس درجہ خوار ہوا

نرمی نقش ہوئی دل پر
اور یہ پہلی بار ہوا

رستہ کھوٹا کرنے پر
رہبر بھی رہوار ہوا

اب در پیش ہے باغ مجھے
دل صحرا تو پار ہوا

شیشے نے انگڑائی لی
اور خود سے دوچار ہوا

209

کچھ ایسا ہو گیا ہے یار اپنا
گلہ بنتا ہے اب بیکار اپنا

در و دیوار سے جھڑتی ہے حسرت
کہاں لے جاؤں میں آزار اپنا

پس پردہ بہت بے پردگی ہے
بہت بیزار ہے کردار اپنا

خرابے میں کسے اپنی خبر ہے
اگرچہ کر لیا انکار اپنا

وفورِ نشۂ لغزش کے باعث
ہوا ہے راستہ ہموار اپنا

پتنگے گھیر لاتا ہوں کہیں سے
دیے کی لو سے جو ہے پیار اپنا

رضا یہ پھول ہونے کی تمنا
کسی کے سانس پر ہے بار اپنا

✿✿✿

اُسے کہنا ابھی دریا نہ بھیجے !
اُسے کہنا سمندر سو رہا ہے
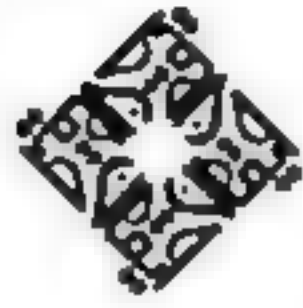
اس نے بھی خود کو بے کنار کیا
جس کا ساحل نے انتظار کیا

آئنے میں سلگ رہا تھا لہو
پھر بھی حیرت کا دل شمار کیا

کورا ہونے سے پیشتر میں نے
ایک اک رنگ اختیار کیا

میری دیوانگی! بھروسہ رکھ
میں نے پانی کو بھی غبار کیا

میں کہیں بھی پہنچ نہیں پایا
کیونکہ سائے کو رہ گزار کیا

تم بھی مصروف ہو رہے ہو رضا
تم نے بھی عشق اختیار کیا؟

چھن چھنا چھن چھنن تراشتے ہیں
ہم مقدس چلن تراشتے ہیں

بے لباسی کے کارخانے میں
کاغذی پیرہن تراشتے ہیں

اس بدن کی طناب ٹوٹے تو
گانٹھ کر پھر بدن تراشتے ہیں

تان لیتے ہیں کینوس خود پر
اور سچ میں گگن تراشتے ہیں

ہم وہاں ہیں جہاں نعیم رضاؔ
شعبدہ گر سخن تراشتے ہیں

کرے ہم کو زنگار
تعلق کی پرکار

مرا بے خودی سے
قبیلے کا سردار

عجب بے کلی ہے
پریشاں ہوں بیکار

کبھی راس آئے
یہ مانوس دیوار

ہوئی جارحانہ
مسائل کی یلغار

تشخص ہمارا
ہمارا یہ اخبار

بدل کر رہو گے
ثقافت کی اقدار

کوئی شاخ تنہا
کوئی پیڑ بیمار

✿✿✿

کپکپاتی ہوئی بینائی، تسلی ہے مجھے
میں یونہی برسرِ پیکار نہیں منزل سے

109
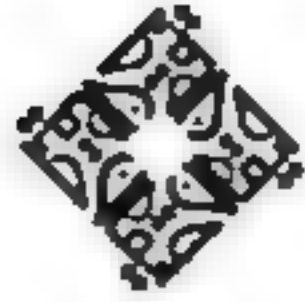
کانپ اٹھا لہو میں لرزش سے
حال سنبھلا بلا کی کوشش سے

آدمیت کو خوف آتا ہے
اک ہمارے خدا کی پرسش سے

مدعی، مدعا ہی بھول گیا
اتنا جھجکا دعا کی خواہش سے

جون صاحب کو خستگی خوش تھی؟
تنگ تھے انتہا کی کاہش سے

دھوپ نکلے گی اور شاخوں کو
خوف آنے لگے گا بارش سے
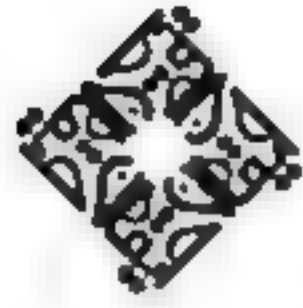
رنگوں میں ترمیم ہوئی
تتلی جب دو نیم ہوئی

خالی دامن والوں میں
بے سمتی تقسیم ہوئی

سب سے پہلے دنیا میں
پسلی کی تعظیم ہوئی

آنکھوں سے اک حکم اٹھا
ہونٹوں سے تسلیم ہوئی

پتوں سے انکار جھڑا
سائے کی تجسیم ہوئی

لوگ جنت میں جا رہے ہوں گے
اور ہم سٹپٹا رہے ہوں گے

حسن مشہور ہو رہا ہو گا
لوگ باتیں بنا رہے ہوں گے

اس کی قامت بھی کیا قیامت ہے
کتنے محشر بپا رہے ہوں گے

وہ کہیں گیت گا رہی ہو گی
ہم کہیں تلملا رہے ہوں گے

اب تو اس بے وفا کو میرے بعد
حادثے پیش آ رہے ہوں گے

شاخ تو ہو گی بے قرار رضا
پھول جو جھلملا رہے ہوں گے
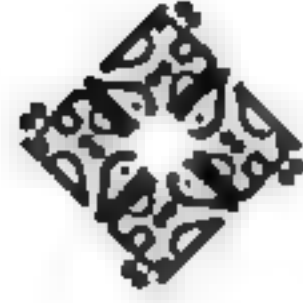
ہم معتدل مزاج ہیں، نے انتہا پسند
اس واسطے ہی ہم نے کیا آئنہ پسند

گویا ہوئے تو سائے کے حق میں دیے بیاں
چپ سادھ لی تو سب نے کہا ابتلا پسند

بازار میں گئے تو ہمیں تو دکھائی دی
گھر آ گئے تو سننا پڑا اے خدا پسند

سرگوشیاں ہوئیں تو انہیں راس آ گئے
جن کی للک نے ہم کو کیا رتجگا پسند

وہ آدمی کہ وقت جسے چھو نہیں سکا
وہ روشنی کہ جس کی ہمیں ہے رضا پسند
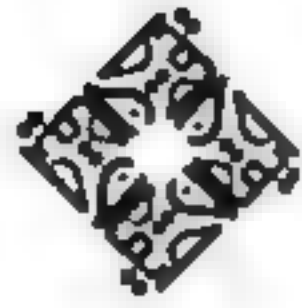
مجھ سے کی ہے جو یا کبھی ہو گی
گفتگو وہ ہی آخری ہو گی

وقت کے تیز رو مسافر سے
ان سنی داستاں سنی ہو گی

کاش سیلن ہو رونما مجھ میں
خشک دیوار ملتجی ہو گی

بھید پاؤ گے تب محبت کا
پہلی جس وقت دوسری ہو گی

وہی ہلچل کے معنی جانتا ہے
جس سے بندوق چل گئی ہو گی

سنگِ قرطاس چھپائے گا
جب اشارے سے روشنی ہوگی

ناز کرتا تھا جب رضا خود پر
تب سمندر پہ کم سنی ہوگی

✿✿✿

عشق جب مسندِ تشہیر پہ آجاتا ہے
سارا الزام رضا میر پہ آجاتا ہے
ہیں مراسم مرے اِک ایسی پری زاد کے ساتھ
جس کا سایہ مری تقدیر پہ آجاتا ہے

109

مخاصمت کو پچھاڑا اگلہ تمام کیا
جدید عہد کی منطق کا احترام کیا

برائے علم یہ تکنیک ہم پہ واجب تھی
جو مظہرات لسانی تھے ان کو عام کیا

یہ فلسفہ یہ تحرک اگرچہ ہیں نایاب
محاکمے کے لیے پھر بھی انتظام کیا

وہ معترف تھا مساوات کا مگر اس نے
فضیلتوں کی اشاعت کا اہتمام کیا

قدیم ربط ہے تشکیک سے ہمارا رضا
سو اس کا فکری تناظر سے التزام کیا

* حمیدہ شاہین کی نذر

لگ رہے تھے اسے لوگ بیزار سے
مسخرہ چل دیا آج بازار سے

اس کو ورثے میں مدہوشیاں ہی ملیں
جس کا سر ہو گیا اونچا دستار سے

سیلِ محبوس ہوں پر گزر گاہ میں
آ ہی جاتے ہیں کچھ سرنگوں غار سے

خواہشوں کے پجاری زمیں پر رہے
آسماں پر گئے لوگ دربار سے

آئنہ تجھ سے کیا کہہ رہا تھا رضاؔ
اب نہ ملنا کبھی ایسے بیمار سے
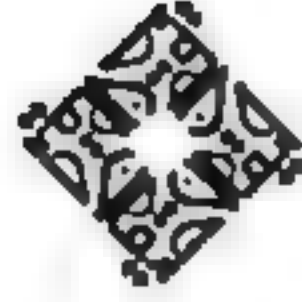
خاشاک ہوئے سرو سمن اپنی بلا سے
ہم کو ہوئی لاحق یہ تھکن اپنی بلا سے

رکھتے ہیں جہاں پیر وہاں جشن ہو یا سوگ
بدلے میں بدلتے ہیں چلن اپنی بلا سے

جو آگ لگی ہے مرے اپنوں نے لگائی
ہوتی رہے اب ان کو جلن اپنی بلا سے

خوش آتا نہیں ہے مجھے صحرا میں بھٹکنا
پھر بھی ہوں بھٹکنے میں مگن اپنی بلا سے

یہ برف جو پگھلی تو رضا ہم نہ رہیں گے
مٹتے ہیں نشانات بدن اپنی بلا سے
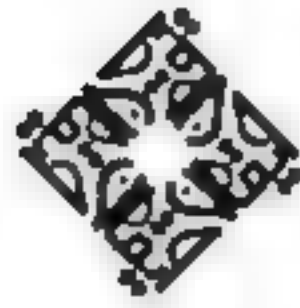
گمرہی زیر و بم نہیں رکھتی
اس لیے روح نم نہیں رکھتی

پاؤں محکم پڑیں تو لگتا ہے
خاک نقشِ قدم نہیں رکھتی

آنکھ ویرانیوں میں رہتی ہے
ورنہ یہ اشک کم نہیں رکھتی

لطف لیتی ہے ہر مصیبت کا
بدگمانی بھرم نہیں رکھتی

ربط پکا ہے بے یقینی سے
یونہی یہ محترم نہیں رکھتی

کہا کس نے زبانیں روکتی ہیں
ہمیں اڑیل چٹانیں روکتی ہیں

ہمیں وہ سرسراہٹ کھینچتی ہے
اگرچہ داستانیں روکتی ہیں

خنک یادیں چلی آئیں تو ان کو
سلامت خاں کی تانیں روکتی ہیں

تواتر سے جو لاحق ہیں خدا کو
وہ شکوے بھی اذانیں روکتی ہیں

خموشی تیر برسائے تو سانسیں
رضا کی بات مانیں روکتی ہیں
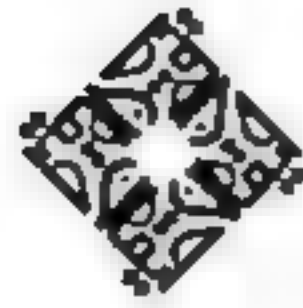
گئے دنوں کے حال میں
پڑے رہو وبال میں

شمار ہو رہا ہوں کیا
میں حسرت کمال میں

سفر کی آرزو نہیں
اسی لیے ہوں جال میں

یہ آبشار جی اٹھے
گرے اگر سفال میں

کسی کی یاد میں رضا
کسی کے ہوں خیال میں
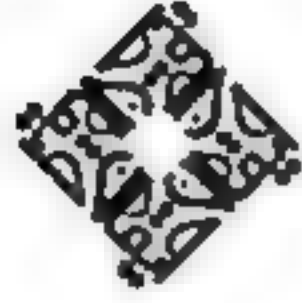
افق سے بہتی کھنکتی آواز
بلا رہی ہے سسکتی آواز

کوئی تسلی سنبھل سکوں میں
مجھے ڈسے گی لپکتی آواز

لحاف اوڑھے کہیں گگن میں
گرج رہی ہے سسکتی آواز

مجھے یہ شک ہے، ہے رفتگاں کی
مرے گلے سے کھسکتی آواز

ہمارے کانوں میں کانپتی ہے
رضا تمہاری اٹکتی آواز

جب معیشت پہ بحث چلنے لگی
باتوں باتوں میں بات بننے لگی

کھنکھنانے لگے شکم اپنے
انتقاماً یہ آگ جلنے لگی

سامراجی بیانیہ سن کر
نظم ابلاغ کو ترسنے لگی

اختتامی اشاریے کے لیے
زندگی ہاتھ سے پھسلنے لگی

شوخیوں اور شرارتوں میں رضا
وہ مرا اعتراف کرنے لگی
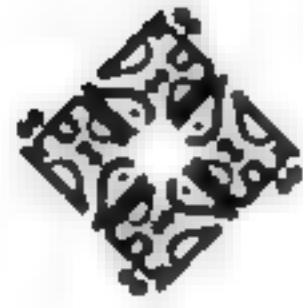
ترش جذبے صداقتوں کے عکس
میں نے نظمائے حیرتوں کے عکس

تھکی ہاری زباں سے ہم آہنگ
خوبصورت علامتوں کے عکس

کوئی انبوہ گھیرتا ہے مجھے
اس پہ آلودہ نفرتوں کے عکس

ہر طرف پھیلتا یہ کہنہ نظام
ہر طرف پیلی رنگتوں کے عکس

جان لیوا مری رضا سے ہوئے
عہد رفتہ کی غیبتوں کے عکس
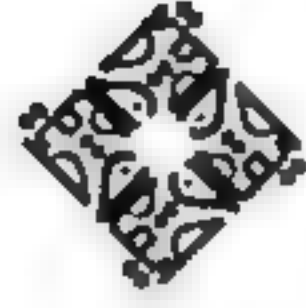
اس نے ایندھن بنایا موجوں کو
اور پھر طیش آیا موجوں کو

وحشتوں سے بھرے کنستر اور
ان کو بیچا، کمایا موجوں کو

میں شناور تھا ڈوب کر میں نے
چال چلنا سکھایا موجوں کو

یہ کٹھالی تپش سے خالی تھی
میں نے اس میں ملایا موجوں کو

کوئی چارہ نہ تھا رضا کے بغیر
بود و نابود کھایا موجوں کو
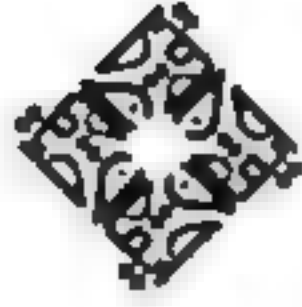
ہمارے دل کی نگریا سرائے جیسی ہے
اسے کہو کہ وہ خیمہ لگائے، جیسی ہے

کہ جس کے نقش قدم روشنی ہیں میرے لیے
مرے لیے مرے اپنے ہی سائے جیسی ہے

سمے کی آنکھ سے دیکھا تو سٹپٹا کے کہا
وہ جل پری مجھے گھر کے کرائے جیسی ہے

وہ ہاتھ آئی تو اس کو مزید چکھوں گا
مزاج سے تو وہ نمکین چائے جیسی ہے

اسے پسند ہے یکتائی سو رضا اس کو
اس احتیاط سے یکتا بنائے جیسی ہے
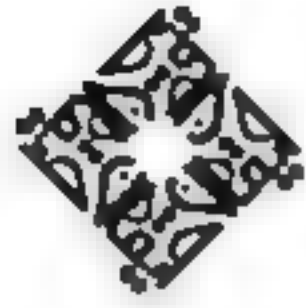
کھا گئی یک لخت نیند
ہائے یہ کم بخت نیند

قتل و غارت پھر سہی
آ رہی ہے سخت نیند

ترجماں ہیں عشق کے
کج کلاہی، تخت، نیند

منتشر ہو جاؤ گے
ہو گی جب دو لخت نیند

ساتھ لائی ہے رضاؔ
اپنا ساز و رخت نیند
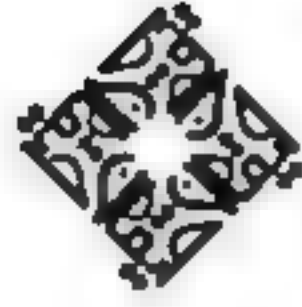
کہ جب ہم مریں گے
وہ گریہ کریں گے؟

انہیں سست کہنا
تو پانی بھریں گے

بہت بوجھ ہو گا
جو سر پر دھریں گے

جنہیں ڈوبنا ہے
وہ کیونکر تریں گے

بساطیں الٹ کر
رضا ہم ڈریں گے
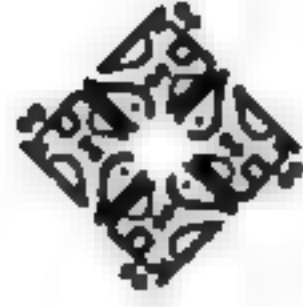
فکر، منطق کہ فلسفہ ہوں میں
ایسا لگتا ہے جا بجا ہوں میں

بد دماغی اسے مبارک ہو
وہ جو کہتا ہے بھیڑیا ہوں میں

اک حسینہ کی گھات میں رہ کر
اپنے نزدیک آ گیا ہوں میں

مجھے وحشت سے خوف آتا ہے
اور وحشی بنا ہوا ہوں میں

وہ نجومی بنا ہوا ہے رضاؔ
جس کو رستہ دکھا رہا ہوں میں
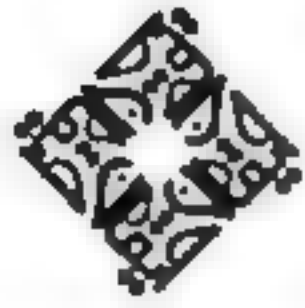
اس طرح بھی خوشی منائی گئی
خود سے بیگانگی رچائی گئی

سازشیں اپنوں میں ہوئیں تقسیم
دشمنوں کی طرف مٹھائی گئی

وہ چلی آئی تھی کمر بستہ
اس قدر چاؤ سے بلائی گئی

ورنہ سارے چراغ بجھ جاتے
پرورش کی قسم اٹھائی گئی

اب میں خود سے بھی بات کرتا نہیں
ایسی پٹی مجھے پڑھائی گئی
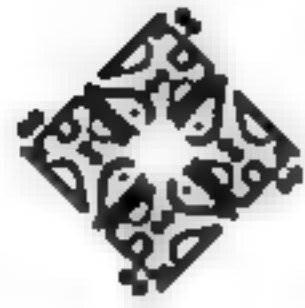
غم کی تفہیم سے جو راہ کھلے
اُس سے ہی رمز لاالہ کھلے

راز تکثیریت کے تازگی کے
سطر در سطر گاہ گاہ کھلے

جو ہیں دہقان بیج بوتے ہی
ان پہ فصلوں کا انتباہ کھلے

نئی راہیں سجھانے والوں پر
کیسے درویش بارگاہ کھلے

اِس توجہ سے دل لبھا نا رضا
مجھ پہ وحشت کھلے گناہ کھلے

دھڑکنوں پر اگر کیا افسوس
ہو گا ماخوذ یا روا افسوس

نسلِ انسان اور ثقافت سے
اعترافی مکالمہ افسوس

یعنی کشمیر اور برما کا
طائرانہ مطالعہ افسوس

ایک دن جشن میں بدل گیا تھا
احتجاجاً کیا گیا افسوس

مجھے ہونا پڑا طلوع رضا
جب اندھیرے نے کھا لیا افسوس
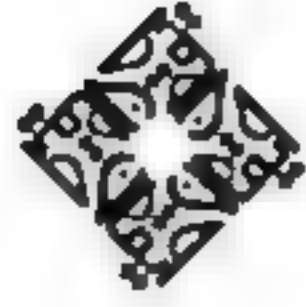
ایسے ماحول میں بھی زندہ ہوں
آدمی ہوں کہ میں درندہ ہوں

واجب القتل تو نہیں ہوں مگر
قید ہوتا ہوا پرندہ ہوں

استعارہ ہوں بربریت کا
اپنی فطرت میں مست ہندہ ہوں

کھا رہا ہوں میں اپنے لاشے کو
آدمیت کا نا دہندہ ہوں

خود سے رہنا ہے دم بہ دم پیکار
یعنی میں خود ضرر کنندہ ہوں

ہم تمہارے ہوئے رقیب کہاں
یہ تواضع ہمیں نصیب کہاں

آگ اگلنا ہمارے بس میں نہیں
عام انسان ہیں ادیب کہاں

چھوڑ کر راستے میں یوں تنہا
چل دیے ہیں مرے نقیب کہاں

وہ بدن جن سے وصل ہے ملزوم
خواب آمیز ہیں عجیب کہاں

سازشیں ہوں رضا جنھیں درپیش
ذہن و دل اُن کے ہیں مُہیب کہاں

آوازیں مرتی نہیں ! مدھم ہو جاتی ہیں ۔ کبھی کبھی اتنا شور گھٹتا ہے کہ کان پڑی آواز تک سنائی نہیں دیتی ۔ کبھی کبھی اس شور میں کوئی سہمی ہوئی آواز سسکیوں کی لے پر بنتی ہوئی سنائی دیتی ہے تو ایک لمحے کے لئے سارا شور پس منظر میں جاتا محسوس ہوتا ہے ۔ نوجوان شاعر نعیم رضا بھٹی کی غزلوں کے مجموعے "ایقان" میں ایسی ہی آوازیں گونجتی ہیں جنہیں سن کر "راہ مضمون تازہ بند نہیں" پر یقین کچھ اور بڑھ جاتا ہے:

مٹکے بھر جانے کے بعد کیا بنتا ہے موجوں کا

اسی شعر کو لے لیجیے ۔ مٹکے اور دریا کے استعارے کو کس طرح نیا کیا گیا ہے ۔ نعیم کی غزلیں عموماً چھ سات اشعار پر مشتمل ہیں لیکن ان چھ سات شعروں کے درمیان کوئی نہ کوئی ایسا شعر ضرور چمک اٹھتا ہے جو اس غزل کا جواز پیش کرتا نظر آتا ہے ۔ نعیم اپنی غزلوں میں جا بجا تازہ مضامین کے بدن کو قدیم استعاروں سے ملبوس کرتا دکھائی دیتا ہے ۔ ویرانی اور غبار غزل کے روایتی مضامین ہیں لیکن اس شعر میں دیکھیے کس طرح پرانے غبار سے نیا منظر تشکیل ہوتا دکھائی دیتا ہے:

ایک تو ہے شدید ویرانی اور کیا کیا مرے غبار میں ہے

کہیں تو حیران کر دینے کی حد تک تازہ کاری نظر آتی ہے جو اس بات کا بھی اعلان کر رہی ہوتی ہے کہ نئے مضمون کے لئے چونکا دینے والا انداز ہی ضروری نہیں ۔ دھیمے لہجے میں ذاتی واردات کا بیان بھی زخم تازہ کی نمود اری میں اپنا کردار ادا کر سکتا ہے ۔ یہ شعر دیکھ لیجیے:

خوف آئے تو کھانس لیتا ہوں یہ دفاعی عمل ہے مات نہیں

مجھے یقین ہے کہ شعر کے سنجیدہ قارئین کے لیے نعیم رضا کی غزلوں کے مجموعہ "ایقان" میں ایسا بہت کچھ موجود ہے جو ان کے ذوق مطالعہ کی تسکین کا باعث بن سکتا ہے ۔

عارف امام

انحراف پبلیکیشنز لاہور ، اسلام آباد

ستّ دریاؤں کا پانی

دلاور علی آزر کی غزلیں

سات دریاؤں کا پانی

دلاور علی آزر کی غزلیں

مرتبین:
لیاقت جعفری
ڈاکٹر محمد سلیم
عمر فرحت

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

SAAT DARYAON KA PAANI

(Poetry)

by: Dilawar Ali Azar

Compiled by

Liaqat Jafri

Dr. Mohd. Saleem

Omar Farhat

Year of Edition 2017

ISBN 978-93-86624-21-5

Price Rs. 400/-

نام کتاب	:	سات دریاؤں کا پانی
شاعر	:	دلاور علی آزر
مرتبین	:	لیاقت جعفری / ڈاکٹر محمد سلیم / عمر فرحت
قیمت	:	۴۰۰ روپے
اشاعت	:	۲۰۱۷ء
تعداد	:	۵۰۰
مطبع	:	روشان پرنٹرس، دہلی۔۶
پیش کش	:	تفہیم پبلی کیشنز، راجوری

ملنے کے پتے

☆ شب خون کتاب گھر، الہ آباد

☆ ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ ☆ تفہیم پبلی کیشنز، راجوری

Published by

EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE

3191,Vakil Street, Kucha Pandit, Lal Kuan, Delhi-6(INDIA)

Ph . 23216162, 23214465, Fax : 0091-11-23211540

E-mail. info@ephbooks com,ephindia@gmail com

website: www.ephbooks com

انتساب

مقصود حُسن

اور

نوید فدا ستی

کے توسط سے

آنے والی نسلوں کے نام

پانی
مآخذ
اور
کیمیا کا شاعر

زنجیر

سات دریاؤں کا پانی

O

یوں دیدۂ خوں بار کے منظر سے اُٹھا مَیں
طوفان اُٹھا مجھ میں سَمُندر سے اُٹھا مَیں

اُٹھنے کے لیے قصد کیا مَیں نے بَلا کا
اب لوگ یہ کہتے ہیں مُقدّر سے اُٹھا مَیں

پہلے تو خدوخال بنائے سرِ قرطاس
پھر اپنے خدوخال کے اندر سے اُٹھا مَیں

اِک اور طرح مجھ پہ کھُلی چشمِ تماشا
اِک اور تجلی کے برابَر سے اُٹھائیں

ہے تیری مری ذات کی یکتائی برابَر
غائب سے تُو اُبھرا تو میسّر سے اُٹھائیں

کیا جانے کہاں جانے کی جلدی تھی دمِ فجر
سورج سے ذرا پہلے ہی بستَر سے اُٹھائیں

پتھرانے لگے تھے مرے اعصاب کوئی دم
خاموش نگاہوں کے برابَر سے اُٹھائیں

اِک آگ مرے جسم میں محفوظ تھی آزرؔ
خس خانہء ظلمات کے اندر سے اُٹھائیں

○

درونِ خواب نیا اک جہاں نکلتا ہے
زمیں کی تہہ سے کوئی آسماں نکلتا ہے

بھلا نظر بھی وہ آئے تو کس طرح آئے
مرا ستارہ پسِ کہکشاں نکلتا ہے

ہَوائے شوق یہ منزل سے جا کے کہہ دینا
ذرا سی دیر ہے بس کارواں نکلتا ہے

مری زمین پہ سورج بوقتِ صبح و مسا
نکل تو آتا ہے لیکن کہاں نکلتا ہے

مقامِ وصل اک ایسا مقام ہے کہ جہاں
یقین کرتے ہیں جس پر گماں نکلتا ہے

یہ جس وجود پہ تم ناز کر رہے ہو میاں
یہی وجود بہت رائگاں نکلتا ہے

بدن کو چھوڑ ہی جانا ہے روح نے آزرؔ
ہر اک چراغ سے آخر دھواں نکلتا ہے

O

بدن میں کون اُجالا لکیر کھینچتا ہے
کہ جیسے خاک پہ دریا لکیر کھینچتا ہے

کسی کسی کو ہے تربیتِ سُخن سازی
کوئی کوئی ہے جو تازہ لکیر کھینچتا ہے

جب اور کوئی مدد کے لیے نہیں آتا
تو عشق دشت میں تنہا لکیر کھینچتا ہے

مَیں دائرے کے تسلُط سے جب نکلتا ہُوں
وہ اِسم پڑھ کے دوبارہ لکیر کھینچتا ہے

عجَب نہیں ہے کہ ہم خاک پر جُدا ہُو جائیں
غضَب نہیں ہے کہ لمحہ لکیر کھینچتا ہے

وہ اپنے بخت کا لکھا بھی کاٹ سکتا تھا
جو اپنے ہاتھ پہ تازہ لکیر کھینچتا ہے

قبولیت کی گھڑی ہے دعا کریں آزر
فلک پہ سُرخ ستارہ لکیر کھینچتا ہے

O

عجیب رنگ عجب حال میں پڑے ہُوئے ہیں
ہم اپنے عہد کے پاتال میں پڑے ہُوئے ہیں

سُخن سرائی کوئی سہل کام تھوڑی ہے
یہ لوگ کس لئے جنجال میں پڑے ہُوئے ہیں

اُٹھا کے ہاتھ پہ دنیا کو دیکھ سکتا ہُوں
سبھی نظارے بس اک تھال میں پڑے ہُوئے ہیں

مَیں شام ہوتے ہی گردوں پہ ڈال آتا ہوں
ستارے لپٹی ہوئی شال میں پڑے ہوئے ہیں

وہ تو کہ اپنے تئیں کر چکا ہمیں تکمیل
یہ ہم کہ فکرِ خدوخال میں پڑے ہوئے ہیں

جہاں بھی چاہوں مَیں منظر اُٹھا کے لے جاؤں
کہ خواب دیدہء اموال میں پڑے ہوئے ہیں

تمام عکس مری دسترس میں ہیں آزر
یہ آئنے مری تمثال میں پڑے ہوئے ہیں

O

کب تک پھروں گا ہاتھ میں کاسہ اٹھا کے میں
جی چاہتا ہے بھاگ لوں دنیا اٹھا کے میں

ہوتی ہے نیند میں کہیں تشکیل خد و خال
اٹھتا ہوں اپنے خواب کا چہرہ اٹھا کے میں

بعد از صدائے کن ہوئی تقسیم ہست و بود
پھرتا تھا کائنات اکیلا اٹھا کے میں

بڑھنے لگا تھا نشۂ تخلیق آب و خاک
وہ چاک اٹھا کے چل دیا کوزہ اٹھا کے میں

کیوں کر نہ سہل ہو مجھے راہ دیارِ عشق
لایا ہوں دشت نجد کا نقشہ اٹھا کے میں

اب مجھ کو اہتمام سے کیجے سپرد خاک
اکتا چکا ہوں جسم کا ملبہ اٹھا کے میں

اچھا بھلا تو تھا تن تنہا جہان میں
پچھتا رہا ہوں خلق کا بیڑا اٹھا کے میں

آزرؔ مجھے مدینے سے ہجرت کا حکم تھا
صحرا میں لے کے آ گیا خیمہ اٹھا کے میں

○

پاؤں توفیق سے رکھیے گا زمیں چلتی ہے
یہ خرابہ ہے فقیروں کی یہیں چلتی ہے

بات کرتا ہے یہاں تان کے سینہ یہ چراغ
اِن مَنڈیروں پہ ہواؤں کی نہیں چلتی ہے

اِک ستائش کہ جسے دل کی تسلّی کہیے
اِک نمائش جو سرِ عالم دیں چلتی ہے

دشت در دشت رواں ہے یہ گھنی موج کہاں
کن جہانوں کے تعاقب میں زمیں چلتی ہے

کیوں نہ قربان ہوں اِس پر کہ ہوائے گزراں
کہیں رک جاتی اے دوست کہیں چلتی ہے

سوچتے رہتے ہیں کمرے میں پڑے صبح و مسا
کیسی تنہائی سرِ عرشِ بریں چلتی ہے

سانس کی ذیل میں آزردہ ہی رائے ہے مری
چل نہیں پاتی مگر اپنے تئیں چلتی ہے

O

خود میں کُھلتے ہُوئے منظر سے نمودار ہُوا
وہ جزیرہ جو سُمندر سے نمودار ہُوا

میری تنہائی نے پیدا کیے سائے گھر میں
کوئی دیوار کوئی دَر سے نمودار ہُوا

چاروں اطراف مرے آئینے رکھے گئے تھے
مَیں ہی مَیں اپنے برابر سے نمودار ہُوا

آج کی رات گزاری ہے دیے نے مجھ میں
آج کا دن مرے اندر سے نمودار ہوا

کیا عجب نقش ہے وہ نقش جو اس دنیا کے
کہیں اندر کہیں باہر سے نمودار ہوا

ایک شعلے کی لپک نور میں ڈھل کر آئی
ایک کردار بہتر سے نمودار ہوا

حق کی پہچان ہوئی خلق کو آزر اُس وقت
جب علی آپ کے بستر سے نمودار ہوا

O

سات دریاؤں کا پانی ہے مرے کوزے میں
بند اک تازہ کہانی ہے مرے کوزے میں

تم اِسے پانی سمجھتے ہو تو سمجھو صاحب
یہ سمندر کی نشانی ہے مرے کوزے میں

میرے آباء نے جوانی میں مجھے سونپا تھا
میرے آباء کی جوانی ہے مرے کوزے میں

چاروں سمتوں میں کوئی شے بھی اگر ہے موجود
اُس نے وہ لا کے گرانی ہے مرے کوزے میں

آن کی آن گذرتا ہے زمانہ اِس پر
وقت کی نقل مکانی ہے مرے کوزے میں

جانے کس خاک سے یہ ظرف ہُوا ہے تعمیر
جانے کس گھاٹ کا پانی ہے مرے کوزے میں

دیکھنے والو نئے نقش ملیں گے تم کو
سوچنے والو گرانی ہے مرے کوزے میں

قرض ہے مجھ پہ جو اِک عکس تمنا آزر
اِس نے کیا شکل بنانی ہے مرے کوزے میں

O

ہوس سے جسم کو دو چار کرنے والی ہَوا
چلی ہوئی ہے گنہ گار کرنے والی ہَوا

یہیں کہیں مرا لشکر پڑاو ڈالے گا
یہیں کہیں ہے گرفتار کرنے والی ہَوا

تمام سینہ سپَر پیڑ جُھکنے والے ہیں
ہَوا ہے اور نگوں سار کرنے والی ہَوا

پڑے ہوئے ہیں یہاں اب جو سَر بریدہ چراغ
گزشتہ رات تھی، یلغار کرنے والی ہَوا

ہماری خاک اُڑاتی پھرے ہے شہر بہ شہر
ہماری روح کا اِنکار کرنے والی ہَوا

اِسی خرابے میں رہنے کی ٹھان بیٹھی ہے
بدن کا دشت نہیں پار کرنے والی ہَوا

نہ جانے کون طرف لے کے چل پڑے آزر
دُھویں سے مجھ کو نمودار کرنے والی ہَوا

○

بے ساختہ آواز کے پیکر سے گزر جاؤں
منظر سے گزرتے ہوئے منظر سے گزر جاؤں

اِس بات پہ موقوف ہے صدیوں کی مسافت
اُس آنکھ میں ٹھہروں کہ برابر سے گزر جاؤں

مٹی کی طرح تُو بھی مری حد سے نکل جائے
پانی کی طرح مَیں بھی ترے سر سے گزر جاؤں

مجھ سامنے رکھے ہوں مرے پھول مرے خواب
اکثر سے اُلجھتا ہُوا اکثر سے گزر جاؤں

اِس بار کوئی اور طلب ہو مرے دل میں
اِس بار تو موجود و میسّر سے گزر جاؤں

شورش سے کروں کارگہِ خاک کو پامال
امکان میں رکھے ہوئے اِس ڈر سے گزر جاؤں

اِک حشر اُٹھا دے مری شوریدہ مزاجی
خاموش اگر گنبدِ بے در سے گزر جاؤں

جس طرح گزرتا ہوں مَیں صحرائے جنوں سے
ایسے ہی کسی روز سمندر سے گزر جاؤں

دم بھر کو رکوں قریۂ خاشاک میں آذر
پھر دیکھتے ہی دیکھتے اِس پَر سے گزر جاؤں

○

مخفی ہیں ابھی درہم و دینار ہمارے
مٹی سے نکل آئیں گے اشجار ہمارے

الفاظ سے کھینچی گئی تصویرِ دو عالم
آواز میں رکھے گئے آثار ہمارے

زنگار کیا جاتا ہے آئینۂ تخلیق
اور نقش چلے جاتے ہیں بے کار ہمارے

کچھ زخم دِکھا سکتا ہے یہ روزنِ دیوار
کچھ بھید بتا سکتی ہے دیوار ہمارے

کیوں چار عناصر رہیں پابندِ شب و روز
آزاد کیے جائیں گرفتار ہمارے

کیوں شام سے ویران کیا جاتا ہے ہم کو
کیوں بند کیے جاتے ہیں بازار ہمارے

کیا آپ سے اب سختی بے جا کی شکایت
جب آپ ہُوئے مالِک و مُختار ہمارے

تحسین طلب رہتے ہیں تا عُمر کہ آزر!
پیدا ہی نہیں ہُوتے طرَف دار ہمارے

○

مَیں سُرخ پھول کو چُھو کر پلٹنے والا تھا
وہ جذب تھا کہ مرا جسم کٹنے والا تھا

اُس ایک رنگ سے پیدا ہوئی یہ قوسِ قُزح
وہ ایک رنگ جو منظر سے ہٹنے والا تھا

مرے قریب ہی اِک طاق میں کتابیں تھیں
مگر یہ دھیان کہیں اور بٹنے والا تھا

عجیب شان سے اُتری تھی دھوپ خواہش کی
مَیں اپنے سائے سے جیسے لپٹنے والا تھا

طویل گفتگو ہوتی رہی ستاروں سے
نگار خانۂ ہستی اُلٹنے والا تھا

زمیں پہ آمدِ آدم کا شور برپا ہوا
وگرنہ رزق فرشتوں میں بٹنے والا تھا

خدا کا شکر ہے نشہ اُتر گیا میرا
کہ مَیں سبو میں سمندر اُلٹنے والا تھا

لپک رہی تھی کوئی آگ اِس طرف آزرؔ
مَیں اُس سے دور بہت دور ہٹنے والا تھا

○

ورَق پہ حرف و حکایات کے ستارے ہیں
تمام لفظ مُناجات کے ستارے ہیں

•

مَیں ڈوبتا ہوں اُدھر وہ طلوع ہوتا ہے
کہ دونوں مختلف اوقات کے ستارے ہیں

•

ہمارے ہاتھ میں ہے چرخِ نیلگوں کی عطا
ہمارے کاسے میں خیرات کے ستارے ہیں

دمک رہا ہے اگر آسمانِ شعر و سُخن
کئی تو اِس پہ مضافات کے ستارے ہیں

مَیں دل میں سینت کے رکھتا ہوں روشنی اِن کی
نظَر میں ارض و سماوات کے ستارے ہیں

تُو جانتا ہے کسے کتنی روشنی ہے بہت
سبھی ستارے ترے ہات کے ستارے ہیں

ہمارے بعد دھواں ہوگا آسماں آزر
ہم آہ بھرتی ہوئی رات کے ستارے ہیں

O

ڈور کے ایک نظارے سے نکل کر آئی
روشنی مجھ میں ستارے سے نکل کر آئی

جس نے کشتی کو ڈبویا سر و سامان سمیت
وہ گھنی موج کنارے سے نکل کر آئی

راکھ جھاڑی جو بدن کی تو اچانک باہر
آگ ہی آگ شرارے سے نکل کر آئی

پیڑ مبہوت ہُوئے دیکھ کے اِس منظر کو
دھوپ جب اُس کے اشارے سے نکل کر آئی

آنکھ میں اشک ریاضت سے ہُوا ہے پیدا
یہ نمی وقت کے دھارے سے نکل کر آئی

کون تکیہ کرے مہتاب کی اس روشنی پر
سامنے بھی جو سہارے سے نکل کر آئی

خود بھی حیران ہُوں یہ سوچ کے آزر اب تک
زندگی کیسے خسارے سے نکل کر آئی

○

ہر لحظہ چھلکتی رہے اندر سے بھری آنکھ
پابند نہیں رہتی سَمُندَر سے بھری آنکھ

تصویر سے آگے کی طلب تھی مرے دل میں
سو مَیں نے کسی اُور ہی منظَر سے بھری آنکھ

ڈرتا ہُوں جنوں مجھ سے مرا خواب نہ لے جائے
خالی ہی نہ کر دوں کہیں بھیتَر سے بھری آنکھ

اک جذب تھا الفاظ میں رکھا ہُوا جس نے
اندر سے مرا دل بھرا باہر سے بھری آنکھ

شاید اُسے امکان کا اندازہ نہیں تھا
جس شخص نے موجود و میّسر سے بھری آنکھ

جب کچھ بھی نہیں مل سکا رستے میں تو اک دن
ہم بادیہ پیماؤں نے صرصر سے بھری آنکھ

ورنہ مجھے کب ان پہ یقیں آنا تھا آزرؔ
رنگوں نے مرے سامنے منظر سے بھری آنکھ

O

کوئی صدا نہ کوئی نوحہ کان پڑتا ہے
عجب سکوت ہے کیا کیا گمان پڑتا ہے

میں جھیلتا ہوں سرِ چشم سب نشیب و فراز
کہیں زمین کہیں آسمان پڑتا ہے

انڈیل دیتا ہوں میں اس میں اپنی آنکھوں کو
مجھے قریب ہی کہ شمع دان پڑتا ہے

رکے جو شاخ گرہ ڈالتی ہے سانسوں میں
ہوا چلے تو بدن پر نشان پڑتا ہے

گریز لفظ ہی ہوتا ہے فیصلے کا جواز
سماعتوں پہ عجب وقت آن پڑتا ہے

عجب ہی کیا ہے کہ اس میں قیام ہو میرا
جو لامکان میں مجھ کو مکان پڑتا ہے

مرا اور اس کا تعلق عجیب ہے آزرؔ
بس ایک خوابِ دگر درمیان پڑتا ہے

O

لوگ زندہ تھے خیالوں کے پری خانے میں
آنے والے نے بہت وقت لیا آنے میں

یک بہ یک پھول کھلے رنگ نے کروٹ بدلی
کون گلشن سے چلا آتا ہے ویرانے میں

یہ الگ بات کے نقشے میں نہیں ہے موجود
اِک خزانہ ہے اِسی دشت کے تہہ خانے میں

تُم کو معنی سے علاقہ ہے تو رکھو صاحب
مَیں تو مصروف ہوں لفظوں کی ہوا کھانے میں

جانے یہ کون سے نقطے پہ رکے دیدہ و دل
اُلجھنیں بڑھتی چلی آتی ہیں سلجھانے میں

جو سمجھتا ہو اُسے بارِ دگر کیا کہنا
فائدہ کوئی نہیں بات کے دہرانے میں

صاحبِ کشف ہو آزر تو یہ بتلاؤ مجھے
دیر کتنی ہے درختوں پہ ثمر آنے میں

O

طاق پہ اُن کے پَر و بال سجائے گئے ہیں
جو پرندے کہیں دیکھے، نہ دِکھائے گئے ہیں

ابتدا یہ تھی کہ ہم باغ میں بیٹھے ہوئے تھے
انتہا یہ ہے کہ ہم دشت میں لائے گئے ہیں

یہ وہ دھڑکن ہے، جسے عشق ہُوا ہے تعلیم
یہ وہ آنکھیں ہیں، جنھیں خواب دِکھائے گئے ہیں

کیسی آواز کہ جو شور میں گُم ہو جائے
کون سے نقش جو پانی پہ بنائے گئے ہیں

اب کسی شکل کا پرتَو بھی نہیں لہروں پر
بر سرِ آب جو منظر تھے، مِٹائے گئے ہیں

دَم بہ دَم کھینچتی ہے اُس گُل خواہش کی مہک
ورنہ مٹی میں کئی پھول کھِلائے گئے ہیں

تاکہ طیور یہاں نغمہ سرائی سیکھیں
اِن درختوں کو مرے گیت سُنائے گئے ہیں

آتشِ شوق نے سب یاد بھُلا دی اپنی
جانے ہم آپ جلے تھے کہ جلائے گئے ہیں

کوئی اِس رمز سے آگاہ کہاں ہو پایا
جسم امکان سے آگے نہیں سایے گئے ہیں

اور مصرف ہی بھلا کیا ہے ہمارا، آزرؔ!
آنے والوں کے لیے راہ بنائے گئے ہیں

O

تم جو کہتے ہو کہ اظہار کرو گے صاحب
شام کو اور پُراسرار کرو گے صاحب

جیسا محسوس کیا ہم نے بتایا تم کو
اب فقیروں سے بھی تکرار کرو گے صاحب

یعنی اِس خواب کو تعبیر نہیں کر سکتے
گویا اِس خواب کو مسمار کرو گے صاحب

پہلے دن ڈوبا اور اب دل کی عجب حالت ہے
کب ستاروں کو نمودار کرو گے صاحب

بیٹھ کر سایۂ دیوارِ تمنا میں عبث
اِن درختوں کو نگوں سار کرو گے صاحب

جسم سے ہوتے ہوئے روح تلک آؤ گے
دیر سے مجھ کو خبر دار کرو گے صاحب

بود و نابود کے بارے میں نہ سوچو ورنہ
اپنے ہونے سے بھی اِنکار کرو گے صاحب

مَیں کہاں تک یونہی خاموش رہوں گا آزرؔ
تم کہاں تک مرا اِنکار کرو گے صاحب

———

○

شیشہء وقت میں اب دیکھیے کیا ٹوٹتا ہے
شام ہوتی ہے کہ سورج کا نشہ ٹوٹتا ہے

بستر مرگ پہ کیوں خواہش نو روز کریں
نیند ٹوٹے تو کہاں خوفِ خدا ٹوٹتا ہے

کون جھانکے گا مری روح کی گہرائی میں
کون دیکھے گا مرے جسم میں کیا ٹوٹتا ہے

ایک ہوتا ہے یہاں آ کے لہو اور پانی
جس جگہ مِلتا ہے ساحل اُسی جا ٹوٹتا ہے

عکس جم جاتے ہیں جب برف کی صورت مجھ میں
آئنہ ہوتا ہُوا نقش بجا ٹوٹتا ہے

سر بہ سر وقت کو تجسیم کیا ہے مَیں نے
ایک لمحے سے فقط لمحہ نُما ٹوٹتا ہے

پیکرِ حرف عجب منبعِ منطق ہے میاں
سطر بن جائے تو مصرع میں خلا ٹوٹتا ہے

آسماں ٹوٹ چُکا اپنے سروں پر آزرؔ
اب تو آنکھوں پہ کوئی سیلِ بلا ٹوٹتا ہے

O

زمیں سے کوئی تعلق نہ آسمان سے ہے
مرا خمیر کسی تیسرے جہان سے ہے

اگر یہ وسعتِ افلاک ہے تو کم ہے ابھی
طلب کچھ اور ہی مجھ کو مری اُڑان سے ہے

مکاں کو کوئی گلہ ہے تو وہ مکین کا ہے
مکیں کو کوئی شکایت ہے تو مکان سے ہے

تمام عمر کی جس میں تھکان اُترے گی
وہ ایک لمحہ بھی شاید تمہارے دھیان سے ہے

یہی سبب ہے کوئی فیصلہ نہ ہونے کا
مرا عدو بھی کسی اُونچے خاندان سے ہے

یہ بات بات پہ طعنوں سے لگ رہا ہے مجھے
کہ سم کا ذائقہ شاید تری زبان سے ہے

مجھے تو عشق کی آزرؔ سمجھ نہیں آئی
یہ قصہ چھیڑ دیا تو نے درمیان سے ہے

O

مٹی کی یاد دل سے بھلانا پڑے گی کیا
اِس دشت میں بھی خاک اُڑانا پڑے گی کیا

کل تک مری جبین پہ سلوٹ کہیں نہ تھی
یہ بات آئنے کو بتانا پڑے گی کیا

لکھ لکھ کے یونہی شعر مِٹا تا رہوں گا مَیں
اُفتادگیء طبع دکھانا پڑے گی کیا

یاد آ رہا ہے شام سے پیڑوں کا سبز جھنڈ
جنگل مَیں مجھ کو رات بتانا پڑے گی کیا

دھندلا چکا ہوں زندگی مَیں اپنی آنکھ میں
چہرے پہ میرے گردِ زمانہ پڑے گی کیا

لکھنا پڑے گی قتل کی روداد ہو بہ ہو
کاغذ کو سُرخ آگ دکھانا پڑے گی کیا

آزر نہ سہل ہو گی یہ منزل خیال کی
مُشکل سے دھونی اپنی رمانا پڑے گی کیا

O

موج دَر موج مری راہ میں اَنگ آتا ہے
مَیں وہ دریا ہوں جسے بہنے کا ڈھنگ آتا ہے

سال ہا سال خزاں جھیلنا پڑتی ہے۔یہاں
مُدّتوں بعد کسی شاخ پہ رنگ آتا ہے

سوچتے سوچتے ہُوتی ہے وہ صورت مَعدوم
دیکھتے دیکھتے آئینے میں زَنگ آتا ہے

ذکر کیوں کیجے اگر ذکر نہیں اِس قابِل
بات کیوں کیجے اگر بات میں لَنگ آتا ہے

بے نیازانہ گُذرتے ہیں فقیر اِس رہ سے
نام جاتا ہے نہ اِس عشق میں ننگ آتا ہے

اِس خرابے میں جو رہتے ہیں عَبَر ہے اُن کو
ناگہاں قافلۂ تیر و تفنگ آتا ہے

آزَر اِس ہجر کے دوران کھُلا ہے کہ یہ جسم
سانس لینے کی مَشقت سے بھی تنگ آتا ہے

○

ترے چراغ کی لو سے لہولہان تھا مَیں
مگر تمام فرشتوں میں کامران تھا مَیں

وہ اِسم یاد ہے جو تم نے پڑھ کے پھونکا تھا
وہ رات یاد ہے جس رات نیم جان تھا مَیں

تمام آیتیں مجھ پر اُتاری جارہی تھیں
اِک ایسے وقت میں جس وقت بے امان تھا مَیں

ادھر زمین ادھر آسمان دھرا ہوا تھا
عجیب حال تھا دونوں کے درمیاں تھا میں

یہ شکر ہے کہ تم آئے ہو اب مجھے ملنے
گئے زمانوں میں ویسے بھی داستان تھا میں

مجھے تو یاد نہیں زندگی مگر وہ لوگ
بتا رہے تھے کے اس وقت نوجوان تھا میں

نئے جہان کے کچھ پھول کھل رہے تھے وہاں
قدیم باغ میں رنگوں کے درمیاں تھا میں

سخن کے باب میں اک نام ہے علی آزر
علی کے نام کا صدقہ ہے بے نشان تھا میں

O

عشق کو دین محبت کو دعا کہتا ہے
اِس پیمبر سے مِلو کِتنا نیا کہتا ہے

یہ الگ بات کہ سُنتا نہیں کوئی ورنہ
کچھ نہ کچھ قافلہء صوت و صدا کہتا ہے

دیکھ لیتے ہیں دِکھاتی ہے یہ دُنیا جو کچھ
مان لیتے ہیں بھَلے جو بھی خدا کہتا ہے

شوق کہتا ہے کہ منزل پہ رکھے اگلا قدم
راستے سے بھی تو کچھ پوچھیے کیا کہتا ہے

اپنا لکھا ہُوا پڑھتا ہوں تو کھلتا ہے یہ رمز
کوئی تو ہے جو مجھے مجھ سے سوا کہتا ہے

مَیں سمجھتا تھا مری رائے ہی کامل ہے مگر
آئنہ آپ کے بارے میں بجا کہتا ہے

میرے اشعار پڑھو گے تو کُھلے گا آزر
خواب الفاظ میں ڈھل جائے تو کیا کہتا ہے

———

O

چلے گا اور کوئی اِس پہ آگے آتے ہوئے
مَیں صرف ہوگیا جو راستہ بناتے ہوئے

روانہ ہوتا ہوں اِک صبح کے سفر پر مَیں
قدیم طاق میں اپنا دیا جلاتے ہوئے

رکا ہوں دیکھنے کو اور روز و شب میرے
گُذر رہے ہیں مری شعلگی بڑھاتے ہوئے

اِنہیں مُعبّر ہی نہیں اِن کے ساتھ کیا ہوگا
یہ لوگ خوش ہیں مرے دائرے میں آتے ہوئے

وہ بے نیاز ہے اُس نے حساب کیا رکھنا
کسی کے دل پہ نئی روشنی گراتے ہوئے

مَیں آن بیٹھا ہوں کس دائرے میں کیا معلوم
یہ کون لوگ ہیں پی کر سبو بڑھاتے ہوئے

کنارِ شام کی بابت بس اِتنا یاد رہا
پکارتے ہوئے دو ہاتھ ڈوب جاتے ہوئے

اَٹی ہے آنکھ مری اپنی گرد سے آزر
کٹے ہیں ہاتھ مرے آئینہ اٹھاتے ہوئے

O

آزر رہا ہے تیشہ مرے خاندان میں
پیکر دکھائی دیتے ہیں مجھ کو چٹان میں

سب اپنے اپنے طاق میں تھرا کے رہ گئے
کچھ تو کہا ہوا نے چراغوں کے کان میں

مَیں اپنی جستجو میں یہاں تک پہنچ گیا
اب آئینہ ہی رہ گیا ہے درمیان میں

نکلی نہیں ہے دل سے مرے بددعا کبھی
رکھے خدا عدو کو بھی اپنی امان میں

منظر بھٹک رہے تھے در و بام کے قریب
مَیں سو رہا تھا خواب کے پچھلے مکان میں

لذت ملی ہے مجھ کو اذیت میں اس لیے
احساس کھینچتا تھا بدن کی کمان میں

آزرؔ اسی کو لوگ نہ کہتے ہوں آفتاب
اِک داغ سا چمکتا ہے جو آسمان میں

O

اور تو کیا حاصل تھا ہم کو، ہم اِک دشت کے آہُو تھے
دِل میں اُس کی یاد بسی تھی، آنکھ میں خواب ترازُو تھے

وقت کے ساتھ بدَل جاتی ہے کیفیّت سرشاری کی
صبح کے چہرے پر رونق تھی، شام کی آنکھ میں آنسو تھے

دھوپ کی شدّت سہہ کر مجھ کو، سایہ بہم پہنچاتا ہے
کِتنا اچھا پیڑ ہے بالکل جیسے میرے ابُو تھے

کن الفاظ میں لکھوں مَیں اُس حُسن کی حالت کا احوال
اُس کی آنکھیں آنکھیں تھی' اور اُسس کے ابرُ و ابرُ و تھے

یہ ترتیب یقیناً مجھ کو حق کی طرف سے ہے تعلیم
سب سے آخری مَیں ہوں اِس میں 'سب سے پہلے "یاھُو" تھے

جسم الگ ہونے سے تھوڑی، قسم الگ ہو جاتی ہے
ایک ہی رنگ کے روپ ہیں سارے اِک تصویر کے پہلو تھے

مُدّت بعد ملے تھے آ زر پورے چاند کی رات میں ہم
باہَر سے خاموش تھے دونوں، اندَر سے بے قابُو تھے

O

نہ جانے وقت تھا یا وقت کا تقاضا تھا
زمین کانپتی تھی آسماں لرزتا تھا

بکھر رہے تھے مرے عکس چاپ سے اپنی
مَیں اپنا خواب لیے آئینوں سے گزرا تھا

اک ایسے موڑ پہ آ کر رکا مرا رہوار
جہاں نہ ابر تھا، نے دھوپ تھی، نہ سایہ تھا

خود اپنی دید پہ اپنی تلاش ختم ہوئی
عجیب حالتِ دل تھی، کہیں نہ لگتا تھا

کسی نے روک لیا وقت کو مری خاطر
مَیں ایک لمحہ تھا، آ کر گزرنے والا تھا

عجیب خواب تھا اس جھیل کے کنارے پر
دمِ طلوع مجھے چاند ملنے آتا تھا

مِلا تو پوچھنا آزر کوئی قدیم چراغ
ہوا نے پہلا قدم کب زمیں پہ رکھا تھا

O

سب کو معلوم ہے مَیں ہُوں اُس کا
آئینہ ہو رہا فسوں اُس کا

وہ مجھے دیکھتا رہے اَور میں
دیکھتا دیکھتا رہُوں اُس کا

مجھ میں اک شخص مرنے والا ہے
کوئی بتلائے کیا کروں اُس کا

میں کبھی بات کر سکوں اِس کی
میں کبھی نام لے سکوں اُس کا

میرے سینے کا زخم دیکھو تم
دیکھنا ہے اگر جنوں اُس کا

باغ کی سیر کو نکلتا ہوں
مَیں کوئی رنگ بھانپ لوں اُس کا

میرے حق میں دعا کیا کیجے
مَیں رہوں اور سدا رہوں اُس کا

اُس کے ماتھے پہ داغ ہے آزرؔ
صاف شفاف اندروں اُس کا

O

آنکھ میں خواب زمانے سے الگ رکھا ہے
عکس کو آئنہ خانے سے الگ رکھا ہے

گھر میں گُلدان سجائے ہیں تری آمد پر
اور اِک پھول بہانے سے الگ رکھا ہے

کچھ ہوا میں بھی چلانے کے لئے رکھا جائے
اِس لیے تیر نشانے سے الگ رکھا ہے

اُس کے ہونٹوں کو نہیں آنکھ کو دی ہے ترجیح
پیاسس کو پیاس بجھانے سے الگ رکھا ہے

غیر ممکن ہے کسی اور کے ہاتھ آ جائے
وہ خزانہ جو خزانے سے الگ رکھا ہے

اِک ہَوا سی کہیں باندھی ہے چھُپانے کے لئے
اِک تماشا سا لگانے سے الگ رکھا ہے

خواب ہی خواب میں تعمیر کیا ہے آزرؔ
گھر کو بنیاد اُٹھانے سے الگ رکھا ہے

O

خود اپنی آگ میں سارے چراغ جلتے ہیں
یہ کس ہوا سے ہمارے چراغ جلتے ہیں

جہاں اُترتا ہے وہ ماہتاب پانی میں
وہیں کنارے کنارے چراغ جلتے ہیں

تمام روشنی سورج سے مُستعار نہیں
کہیں کہیں تو ہمارے چراغ جلتے ہیں

تمہارا عکس ہے یا آفتاب کا پرتَو
یہ خال و خد ہیں کہ پیارے چراغ جلتے ہیں

عجیب رات اُتاری گئی محبت پر
ہماری آنکھیں تمہارے چراغ جلتے ہیں

مری نگاہ سے روشن نگار خانۂ حُسن
مرے لہو کے سہارے چراغ جلتے ہیں

نہ جانے کون سی منزل ہے مُنتظر آزر
کہ رہگُذر میں ستارے، چراغ جلتے ہیں

O

آگ لگ جائے گی اک دن مری سرشاری کو
مَیں جو دیتا ہُوں ہَوا روح کی چنگاری کو

ورنہ یہ لوگ کہاں اپنی حدوں میں رہتے
مَیں نے معقول کیا حاشیہ برداری کو

یہ پرندے ہیں کہ درویش ہیں زندانوں کے
کچھ سمجھتے ہی نہیں امرِ گرفتاری کو

اب ہمیں زندگی کرنے میں سہولت دی جائے
کھینچ لائے ہیں یہاں تک تو گراں باری کو

ایک طوفانِ بلا خیز نے منظر بدلا
پیڑ تیار ہوئے رسم نگوں ساری کو

اُس نے وہ زہر ہواؤں میں مِلا یا ہے کہ اب
کونپلیں سَر نہ اُٹھائیں گی نموداری کو

کون کھینچے گا مرے جسم کی زنجیر آزرؔ
کون آسان کرے گا مری دشواری کو

O

پھینکو نہ یونہی کم نظرو سنگ ہوا میں
اُڑتے ہیں پرندے بھی اِسی تنگ ہوا میں

پھیلا مری آواز کا جادو سرِ دنیا
بکھرا مرا شیرازہء آہنگ ہوا میں

رکھیے اِنہیں موسم کی شکستوں سے بچا کر
پھولوں کو نہ لگ جائے کہیں زنگ ہوا میں

دو چند ہوئی جاتی ہے تعمیرِ سماعت
چلتا ہے ہواؤں کے کوئی سنگ ہوا میں

ممنون رہے گا مرے الفاظ کا پیکر
کرتا ہے وہ آواز مری رنگ ہوا میں

ہوتا ہے مگر اور ہی لفظوں کا در و بست
بنتا ہے کوئی اور ہی آہنگ ہوا میں

آزرؔ مجھے تخلیق کی وہ سطح ملی ہے
تصویر بنا سکتا ہوں نیرنگ ہوا میں

O

برائے لیل و نہار آئینے سے گُذرے گا
جہاں کا گرد و غُبار آئینے سے گُذرے گا

لپیٹ لپیٹ کے جُدا ہُو گا عکس خوش انداز
اُلجھ اُلجھ کے یہ تار آئینے سے گُذرے گا

کسی بھی نقش کو زنجیر کی نہیں حاجت
خود آپ چل کے شکار آئینے سے گُذرے گا

نظر نہ ہو تو سوال اُٹھتا ہے نظارے پر
بدن نہ ہو تو غبار آئینے سے گذرے گا

سبب بنا تو کھلے گی گرہ تصور کی
مدد ملی تو مدار آئینے سے گذرے گا

اُٹھا کے دھند زمانوں کی خال وخد سے اُدھر
چراغِ عکس گذار آئینے سے گذرے گا

مَیں کس طرح اُسے پہچان پاؤں گا آزر
جو ایک ہو کے ہزار آئینے سے گذرے گا

O

اس آئینہ خانے میں رسد چاہیے میری
سورج کو نکلنے میں مدد چاہیے میری

میں ہوں جو مِلا سکتا ہوں خلقت کو خدا سے
مخلوق کو تقلید اشد چاہیے میری

کچھ دیکھنے کو میری نظر چاہیے صاحب
کچھ سوچنے کو تابِ خرد چاہیے میری

کیوں مجھ کو مٹانے سے گریزاں ہے ترا ہاتھ
کیا روشنی تارو زِ ابد چاہیے میری

وہ مجھ میں سمایا ہے نہیں جس کی کوئی حد
بے حد ہوں مگر دنیا کو حد چاہیے میری

اِس عشق کو بھی میری توجہ کی ہوس ہے
اُس حُسن کو بھی داد و ستد چاہیے میری

آتا ہے علی نام مرے نام میں آزر
ہر طالبِ رفعت کو سند چاہیے میری

O

آدم کی تشنگی پہ نشانی حدیث ہے
دریا کے پاس سب سے پرانی حدیث ہے

ہر چیز اپنی اصل میں مستور ہے یہاں
ہر شے کی اصل ایک زمانی حدیث ہے

جاری رہے گا ارتقا اِس کائنات میں
بدلیں گے شکل لفظ و معانی، حدیث ہے

پتھر میں رزقِ زیست عطا ہو گا خلق کو
تاویل ہے کوئی نہ کہانی، حدیث ہے

آبادی اپنی حد سے تجاوز کرے تو پھر
ایسے میں کارِ نقل مکانی حدیث ہے

کچھ اس لیے بھی غرق ہُوئے ہیں گزشتگان
ہم نے خدا کی بات نہ مانی حدیث ہے

سچ ہے جو تُو نے آنکھ سے دیکھا ہے دہر میں
حق ہے ترا کہا ہُوا یعنی حدیث ہے

بہتر زمیں کی پیٹھ سے ہُو گا زمیں کا پیٹ
مومن پہ جب ہو زیست گرانی حدیث ہے

آزرؔ ہر ایک جنس گراں ہے جہان میں
مٹی حدیث ہے کہیں پانی حدیث ہے

O

بدن کے دشت سے جب پار ہونے لگتے ہیں
تو خواب اور پُراسرار ہونے لگتے ہیں

عجب طرح ہمیں محروم کر دیا اُس نے
پرائی آگ میں سرشار ہونے لگتے ہیں

اِس انہماک سے تکتا ہوں اُس الاؤ کو مَیں
دھوئیں سے نقش نمودار ہونے لگتے ہیں

ہَوائے صبح پلٹتی ہے جنگلوں کی طرف
درخت نیند سے بے دار ہُونے لگتے ہیں

درود پڑھ کے قدم رکھا جائے دھرتی پر
تو خود ہی راستے ہموار ہُونے لگتے ہیں

وہ باغ چھوڑ کے جاتا ہے اور اُسی لمحے
یہ رنگ پھول سے بے زار ہُونے لگتے ہیں

تمام لفظ جو ترتیب سے رکھوں آزرؔ
خیال اپنے گرفتار ہُونے لگتے ہیں

O

وہ بہتے دریا کی بے کرانی سے ڈر رہا تھا
شدید پیاسا تھا اور پانی سے ڈر رہا تھا

نظر نظر کی یقیں پسندی پہ خوش تھی، لیکن
بدن بدن کی گماں رسانی سے ڈر رہا تھا

سبھی کو نیند آ چکی تھی یوں تو پری سے مل کر
مگر وہ اک طفل جو کہانی سے ڈر رہا تھا

لرزتے ہونٹوں سے گر پڑے تھے حروف اِک دِن
دِل اپنے جذبوں کی ترجمانی سے ڈر رہا تھا

لغاتِ جاں سے کشید کرتے ہُوئے سُخن کو
مَیں ایک حرفِ غلط معانی سے ڈر رہا تھا

جما ہُوا خون ہے رگوں میں نہ جانے کب سے
رکا ہُوا خواب ہے 'روانی سے ڈر رہا تھا

وہ بے نشاں ہے جسے نشاں کی ہَوس تھی، آزر
وہ رائیگاں ہے جو رائیگانی سے ڈر رہا تھا

O

بابِ غزل میں ہر سُخن تازہ بند ہے
کب تک کھُلے گا مجھ پہ جو دروازہ بند ہے

ٹھہرے ہُوئے سرشک میں پیدا ہے موجِ بحر
سہمے ہُوئے سکوت میں آوازہ بند ہے

یہ تہہ ہٹے تو اصل خد و خال دیکھنا
وہ حُسنِ بے مثال پسِ غازہ بند ہے

گر نیند آ بھی جائے تو کچھ فائدہ نہیں
دل کی طرف سے خواب کا دروازہ بند ہے

جاں نذرِ انتظار گذاری ہے عشق میں
دل تحفۂ وصال کا شیرازہ بند ہے

زیرِ زمیں نمو کے مسائل ہیں اَور کچھ
مٹی میں دفن تخمِ گُل تازہ بند ہے

آزرِ گُل خیال سرِ شاخِ آرزو
خوشبو کے انتظار میں خمیازہ بند ہے

○

سخن کی ضرب سے ہر ساز میں گرہ پڑ جائے
مَیں لب ہلاؤں تو آواز میں گرہ پڑ جائے

ہَوس نے جسم کا انجام کار دیکھنا ہے
خدا نہ خواستہ آغاز میں گرہ پڑ جائے

تری بَلا سے لہو کھینچ لے یہ جائے سرشک
پڑے تو چشمِ گُہر ساز میں گرہ پڑ جائے

یہ جُست جو ہی تو سانسیں بحال رکھتی ہے
کبھی جو دل کی تگ و تاز میں گرہ پڑ جائے

وہ مُنتشر ہے کوئی دیکھ لے اُسے جا کر
وہ مُنتظر ہے کہ انداز میں گرہ پڑ جائے

اُداس چاند سے مل آتی ہے چکورا بھی
اگر کہیں پرِ پرواز میں گرہ پڑ جائے

کُھلے جو حرفِ فسوں خیز کا فسوں آ زر
ہر ایک رمز ہر اک راز میں گرہ پڑ جائے

O

کھینچ کر عکس فسانے سے الگ ہو جاؤ
بے نمو آئینہ خانے سے الگ ہو جاؤ

سارا دن ساتھ رہو سائے کی صورت اپنے
شام ہوتے ہی بہانے سے الگ ہو جاؤ

شعر وہ لکھو جو پہلے کہیں موجود نہ ہو
خواب دیکھو تو زمانے سے الگ ہو جاؤ

شاعری ایسے جھمیلوں سے بہت آگے ہے
اِس نئے اَور پُرانے سے الگ ہو جاؤ

نیند میں حضرتِ یوسُف کو اگر دیکھا ہے
عین ممکن ہے ' گھرانے سے الگ ہو جاؤ

احتراماً مرے حلقے میں رہے ہو شامل
اہتماماً مرے شانے سے الگ ہو جاؤ

اُس کو تصویر کرو صفحۂ دل پر، آزر
غیب کا نقش بنانے سے الگ ہو جاؤ

O

چلے بھی آؤ کہ حُجّت تمام ہو چکی ہے
دِیا جلانے کا مطلب ہے شام ہو چکی ہے

گُذر چکی ہے اذیت سے چشمِ خواب آثار
سکوتِ شب سے نظر ہم کلام ہو چکی ہے

جھکائے رکھیں گے ہم یوں ہی اپنی گردن کو
وہ تیغِ تیز اگر بے نیام ہو چکی ہے

جسے بھی دیکھیے ملتا ہے بے نیازی سے
محبتوں کی روش کتنا عام ہو چکی ہے

ہمارے خواب ہوا میں اُڑائے جائیں گے
ہماری نیند پرندوں کے نام ہو چکی ہے

وہ داستاں جو تہِ خاک و خوں لکھی گئی تھی
شروع ہونے سے قبل اختتام ہو چکی ہے

زمیں پہ حشر بپا ہونے کو ہے آخرِ کار
تمام خلق ہوس کی غلام ہو چکی ہے

بتاؤں کیا کہ مکمل مری حیات آذرؔ
بغیر عشق بہ صد اہتمام ہو چکی ہے

O

مجھ کو مٹی سے علاقہ ہے اُسے پانی سے
گویا مل سکتے ہیں دونوں بڑی آسانی سے

خطہء چشم پہ ہر لحظہ نگہ رکھیے گا
خواہشیں نم نہ اُٹھا لیں کہیں نادانی سے

اِس سے پہلے کہ فرشتہ کوئی طعنہ دیتا
اِک ستارہ اُبھر آیا مری پیشانی سے

اب مجھے سبز جزیرے پہ اترنا ہی نہیں
اب ملاقات نہیں ہوگی جہاں بانی سے

دیکھتا کوئی نہیں آنکھ اٹھا کر مجھ کو
فائدہ کیا ہے مجھے چاک گریبانی سے

حیرتی کیوں ہیں مری دشت نوردی پہ یہ لوگ
کیا محبت نہیں ہو سکتی بیابانی سے

آزرؔ اس بار مقدر کو مقدر جانا
کاٹ لی میں نے پریشانی، پریشانی سے

O

کچھ اس ادا سے رخِ عبدہٗ چمکتا ہے
کہ جیسے چاند سرِ آب جُو چمکتا ہے

ہماری آنکھیں دمکتی ہیں' دیکھنے سے اُسے
اور اُس کا چہرہ دمِ گفت گُو چمکتا ہے

یہ سُرخ روشنی پھیلے گی وقت آنے پر
کہ زیرِ سایہء خنجر گلو چمکتا ہے

کوئی تو ہے کہ جسے ضَو ملی ہے سورج سے
کوئی تو ہے جو مرے روبہ رو چمکتا ہے

کچھ اِس طرح سے ہے روشن یہ داغِ پیشانی
کہ جیسے خاک پہ جَم کر لہو چمکتا ہے

وہاں حروف دمکتے ہیں مثلِ کاہ کشاں
ترا خیال جہاں چارسُو چمکتا ہے

نشے کی مار سے سینہ سلگ رہے ہوں گے
وہ تشنگی ہے سبو پر سبو چمکتا ہے

سنہری دھوپ اُجلتی ہے جسم و جاں آزر
تو ذرہ ذرہ نہاں مُو بہ مُو چمکتا ہے

O

اب کسی آنکھ کا جادو نہ فسوں ہے مجھ پر
پھر بھی یہ نشہ سا طاری ہے تو کیوں ہے مجھ پر

یہ الگ بات بتانے کا نہیں اذن مجھے
آئنہ شش جہتِ کُن فیکوں ہے مجھ پر

خواہش نفس کہاں دل میں پنپ سکتی ہے
اِس سے پہلے بھی تمناؤں کا خوں ہے مجھ پر

کیا بتاؤں مری آنکھوں میں لہو ہے کیسے
مہرباں آج کل اک زخمِ دروں ہے مجھ پر

اِس قدر بار اُٹھائے ہوئے جاؤں تو کہاں
عشق مجھ پر ہے، خرد مجھ پہ، جنوں ہے مجھ پر

کوئی پوچھے جو مجھے دار و مدارِ ہستی
مَیں وہ سادہ کہ جواباً یہ کہوں ہے مجھ پر

حالت ایسی ہے کہ لگتا ہے کوئی پاس نہیں
وقت ایسا ہے کہ لگتا ہے سکوں ہے مجھ پر

آزرؔ اِس خواب سے نکلوں تو کہاں جاؤں مَیں
اس سے ہٹ کر بھی کوئی حالِ زبوں ہے مجھ پر

O

قتل کرتے ہُوئے رنگوں کی فراوانی تھی
باغ میں آنکھ کُھلی آنکھ میں حیرانی تھی

درمیاں عشق کا پردہ جو نہ حائل ہُوتا
میرے ہونٹوں کے مقابل تری پیشانی تھی

اِس لیے مجھ کو سہولت تھی سفر کرنے میں
میرا سامانِ سفَر بے سروسامانی تھی

مَیں نے دیوار و در و بام کو تسلیم کیا
اُس سے گھر سے نکلنا بھی تو نادانی تھی

وقت نے آ کے خبر دی تھی خزاں آنے کی
اِن درختوں نے مگر بات نہیں مانی تھی

وصل کی زندہ علامت تھی یہ روشن راتیں
چاند افلاک میں رکھی ہوئی عریانی تھی

کوئی تعبیر کا سودا جو نہیں تھا آزر
خواب ہی خواب تھے آسانی ہی آسانی تھی

○

بڑھا لیا ہے جو ہم نے وہ ہاتھ کٹ جائے
دعا کریں کہ یہ قصہ یونہی نمٹ جائے

مجھے روانہ کیا جا رہا ہے اُس کی طرف
یہ کائنات اگر درمیاں سے ہٹ جائے

مَیں چاہتا ہُوں سو پہنچوں عدو کے خیمے تک
کہ عین وقت پہ میری بساط اُلٹ جائے

بڑھائی جائے کچھ اِس طرح وقت کی رفتار
دِیا جلانے سے پہلے ہی رات کٹ جائے

وہ موج موج سمندر رسوادِ ساحل سے
کچھ اِتنا غور سے دیکھو دماغ پھٹ جائے

بس اُس کا نام ہی لکھا ہو برسرِ قرطاس
سخن تمام اِسی نقطے میں سمٹ جائے

نکل کے سامنے آئے وہ مطلع آزر
جو سر پہ چھایا ہُوا ہے یہ اَبر چھٹ جائے

O

بگڑ گئے ہیں بنانے سے خال و خط اُس کے
کیے ہیں عقل نے کچھ فیصلے غلط اُس کے

وہی خیال ہے ' جس سے جھلکتا ہو محبوب
وہی کتاب ہے ' جس پر ہوں دست خط اُس کے

اُسی نے مجھ سے کہا تھا کہ میں فرشتہ ہُوں
خدانہ خواستہ ' اندازے ہُوں غلط اُس کے

ہُوا جو نقش مکمل تو پھول تھا تصویر
بنا رہا تھا مَیں کاغذ پہ خال و خط اُس کے

اُسی کی روشنی اُور عکس ہیں جہاں بھر میں
چراغ جسم ہوئے آئنے نمط اُس کے

ہمی کو وہ کسی اِمکان میں نہیں رکھتا
ہم ایسے لوگ جو ہُوتے بھی ہیں فقط اُس کے

اِک ایک لفظ مرے دل پہ جیسے لکھتا ہو
لگا ہُوا ہے قلم کو عجیب قط اُس کے

کہ تا وہ اپنی کسی بات سے مُکر نہ سکے
سنبھال رکھے ہیں، آزر! تمام خط اُس کے

O

خواب کھلنے لگا آغازِ نمو میں اپنے
وہ خد و خال لپکتے ہیں لہو میں اپنے

دوست تو دوست ہے دشمن بھی برابر کا جنو
ہو بہ ہو ہم نظر آتے ہیں عدو میں اپنے

کیسے پہچانتی ہے آنکھ نئے لفظوں کو
کیسے رم کرتی ہے آواز گلو میں اپنے

ایک وہ پیاس جو بجھتی ہے سبو سے اپنی
ایک یہ آگ جو ہوتی ہے سبو میں اپنے

یہ کوئی چوغہ نہیں بیٹھ کے سی لیتے ہیں
زخم آتے ہیں کہاں دستِ رفو میں اپنے

دید ہوتی ہے کسی موڑ پہ اُس کی یک دم
پھول کھلتے ہیں اچانک ہی لہو میں اپنے

شہر تو دیکھ لیا آنکھ میں رکھ کر خود کو
اب ذرا آپ مضافات بھی گھومیں اپنے

میں تیمم کو یہاں خاک طلب ہوں آزرؔ
لوگ مصروف سرِ دست وضو میں اپنے

○

دیکھ لو پھر یہ ستارہ نہیں روشن ہونا
بجھ گیا میں تو دوبارہ نہیں روشن ہونا

لاکھ ترکیب کیے جاتے ہوں مٹی سے چراغ
کوزہ گر مان یہ گارا نہیں روشن ہونا

کشتیوں والے مرا رمز سمجھتے ہوں گے
ایسے ہی مجھ پہ کنارہ نہیں روشن ہونا

ہو بھی سکتا ہے یہ آئینہ کسی پر روشن
ہاں مگر سارے کا سارا نہیں روشن ہونا

مجھ میں اِک آگ ہے جو آپ بھڑک اُٹھے گی
اِس طرح مجھ کو گوارا نہیں روشن ہونا

ہم جب آئے تو یہاں پہلے سے طے تھا سب کچھ
یعنی ایمان ہمارا نہیں روشن ہونا

کاش یہ اہلِ سخن بات کی تہہ تک پہنچیں
صرف لفظوں سے نظارہ نہیں روشن ہونا

اِک یہی بات تو روشن ہے ازل سے آزر
عشق میں سود و خسارہ نہیں روشن ہونا

O

سایۂ ابرِ گماں لے جاتا
دھوپ میں دشت جہاں لے جاتا

جل پری ہاتھ پکڑ لیتی مرا
ناو کو آبِ رواں لے جاتا

عین اُسی لمحے تری آنکھ کھُلی
ورنہ مَیں کون و مکاں لے جاتا

کوئی شعلہ سا لپکتا سرِ شام
اور دن بھر کا دھواں لے جاتا

بے اماں شب کا سفر تھا درپیش
جس طرف شورِ سگاں لے جاتا

عشق شمشیرِ گراں مایہ تھا
جو قریبِ رگِ جاں لے جاتا

کوئی خوشبو کہیں گویا ہوتی
پھول کا رنگ جہاں لے جاتا

زندگی ڈھونڈتی رہ جاتی مجھے
مَیں اگر نام و نشاں لے جاتا

چپ سوا چارہ نہیں تھا آزر
اِتنی آوازیں کہاں لے جاتا

O

ورنہ رکنا تھی کہاں باغ میں یلغار مری
وہ تو مَس ہو گئی اِک شاخ سے تلوار مری

میری مِٹی پہ مرے گھر کی بناء رکھی گئی
میرے سائے سے اُٹھائی گئی دیوار مری

مَیں کسی وقت سُبک سَر تھا سُبک رو بھی تھا
مجھ سے مِلتی ہے تو رو پڑتی ہے رفتار مری

کاش وہ ساعتِ صد رنگ پلٹ کر آ جائے
پیاس چمکی تھی تری آنکھ میں اِک بار مری

پھر بھی خاموش ہی رہتا ہوں مَیں اپنے گھر میں
بات سُنتے ہیں اگرچہ در و دیوار مری

مَیں کوئی دائرہ کھینچوں گا یہاں سب سے الگ
شوق غالب ہے سو رکتی نہیں پرکار مری

آزرِ احباب کی طینت پہ گراں گذرے گی
آئے دن بڑھتی ہوئی قوتِ اظہار مری

O

منظر سے اُدھر خواب کی پسپائی سے آگے
مَیں دیکھ رہا ہوں حدِ بینائی سے آگے

یہ قیس کی مسند ہے سو زیبا ہے اُسی کو
ہے عشق سراسر مری دانائی سے آگے

شاید مرے اجداد کو معلوم نہیں تھا
اِک باغ ہے اِس دشت کی پہنائی سے آگے

سب دیکھ رہی تھی پسِ دیوار تھا جو کچھ
تھی چشمِ تماشائی، تماشائی سے آگے

اِک دن جو یونہی پردۂ افلاک اُٹھایا
برپا تھا تماشا کوئی تنہائی سے آگے

ہم قافیہ پیمائی کے چکر میں پڑے ہیں
ہے صنعتِ غزل قافیہ پیمائی سے آگے

مجھ کاغذی کشتی پہ نظر کیجے آزرؔ
بڑھتی ہے جو لہروں کی توانائی سے آگے

○

ممکن ہے کہ ملتے کوئی دَم دونوں کنارے
اِک موج کے محتاج تھے ہم دونوں کنارے

یوں آنکھ جھپکتا نہیں بہتا ہُوا پانی
منظر میں نہ ہُو جائیں بہَم دونوں کنارے

آباد ہمیشہ ہی رہے گا یہ سَمُندَر
رکھتے ہیں مچھیروں کا بھرَم دونوں کنارے

تا عُمر کسی موجۂ خوش رو کی ہَوس میں
بے دار رہے دَم ہمادِم دونوں کنارے

کھلتی ہے یہاں آ کے مِرے خواب کی وسعت
ہوتے ہیں مِری آنکھ میں ضَم دونوں کنارے

یہ فاصلہ مٹی سے کبھی طے نہیں ہو گا
دریا کی ہیں وسعت پہ قسم دونوں کنارے

سب سیر کو نکلیں گے سرِ ساحلِ ہر خواب
سیاحوں کے چومیں گے قدم دونوں کنارے

کشتی کی طرح عمر خضر گیر ہے، آزر!
ہستی کے ہیں موجود و عدم دونوں کنارے

O

زندگی راکھ سے تعبیر چراغوں کی نہ ہو
صرف جلنا ہی تو تقدیر چراغوں کی نہ ہو

طاق دیوار میں رکھتے ہوئے سوچا میں نے
کیوں عمارت کوئی تعمیر چراغوں کی نہ ہو

شام ہونے سے ذرا پہلے جلا لیجئے گا
ایک لمحے کی بھی تاخیر چراغوں کی نہ ہو

ایسی وحشت ہے کہ سائے سے گریزاں ہوائیں
روشنی مجھ سے بغلگیر چراغوں کی نہ ہو

سطر در سطر یہاں لفظ سے لو پھوٹتی ہے
یہ جو تحریر ہے تصویر چراغوں کی نہ ہو

کوئی شعلہ نہ بھڑک پائے سرِ طاقِ وجود
ایک خواہش بھی جو تسخیر چراغوں کی نہ ہو

دن نکلنے پہ ہی آمادہ نہیں ہے آزر
صبح کے پاؤں میں زنجیر چراغوں کی نہ ہو

O

شہر میں کوئی نہیں جس کو دعا دی جائے
سو مری عمر درختوں کو لگا دی جائے

سوئے رہ جائیں پسِ پردۂ شب ماہ و نجوم
آج کی رات چراغوں کو سزا دی جائے

انہیں اطراف میں موجود ہے وہ قوسِ قزح
آنکھ منظر کے تعاقب میں لگا دی جائے

مَیں نہیں کہتا مرے ساتھ چلیں نیند میں لوگ
کم سے کم خواب کی تعبیر بتا دی جائے

کوئی پہلو ہو کہ لفظوں میں دھڑک اُٹھے حیات
کوئی صورت ہو کہ یہ نام نہا دی جائے

کھائے جاتا ہے شب و روز نئے عشق کا زعم
عین ممکن ہے تری یاد بھلا دی جائے

آزر اک اشک مری آنکھ سے رخصت کر کے
ایک شعلے کو مرے دل میں جگہ دی جائے

O

حالتِ حالِ دلِ زار کوئی سُنتا ہے
چُپ کھڑی رہتی ہے دیوار کوئی سُنتا ہے

بے طرح شور مچانے سے بھلا کیا ہو گا
کون سُنتا ہے مرے یار کوئی سُنتا ہے

شورشِ زخمِ تمنا ہے سرِ شاخِ وجود
دیکھنا یہ ہے کہ اِس بار کوئی سُنتا ہے

باغ میں کرتے ہیں سرگوشیاں گل آپس میں
شاخ سے لگ کے یوں ہی خار کوئی سُنتا ہے

چاہیے ہے کسی خواہش کا سہارا مجھ کو
گرنے والی ہے یہ دیوار کوئی سُنتا ہے

رشک آتا ہے اُسے فنِ سُخن سازی پر
جب مرا مصرعِ تہہ دار کوئی سُنتا ہے

عالمِ ہست میں یوں حشر بپا ہُوں آزر
جس طرح سے مرے اشعار کوئی سُنتا ہے

○

سلطنت جس کو میسر ہو فراوانی کی
اسے حاجت ہی کہاں تختِ سلیمانی کی

اِسم پڑھتے ہوئے ہونٹوں نے مرا بوسہ لیا
پل میں اوقات بڑھا دی مری پیشانی کی

اُس نے آہستہ سے انصاف کا پلڑا کھینچا
اور سنا دی گئی مٹی کو سزا پانی کی

دل سزاوار ہوا ساعتِ غفلت کے تئیں
ایک تو عشق کیا دوسرا نادانی کی

چشم بخشی ہے تو ظاہر ہے نظارا ہوگا
کوئی صورت نہیں بنتی یہاں حیرانی کی

تری آسانی نے مشکل میں مجھے ڈال دیا
مری مشکل نے ترے واسطے آسانی کی

بعد از میر کوئی اور سخن بنتا ہے
جانے کیا سوچ کے یاروں نے غزل خوانی کی

خلق سے خالق تخلیق عیاں ہے آزر
آئینہ شکل دکھاتا ہے جہاں بانی کی

O

کیا اذیت ہے کہ سرشار چلے جاتے ہیں
ہم محبت میں لگاتار چلے جاتے ہیں

تم نے دیوار سے بھی سر نہیں پھوڑا جا کر
جانے والے پسِ دیوار چلے جاتے ہیں

خواب ایسا ہے جو تصویر نہیں ہو سکتا
نقش ایسے ہیں کہ بے کار چلے جاتے ہیں

سوچنے ہی میں اُبھرتی ہے وہ صورت کچھ دیر
دیکھنے سے لب و رخسار چلے جاتے ہیں

بے ثمر جاتے ہیں ہم راہ لیے بے ثمری
اُور ثمر دار ثمر دار چلے جاتے ہیں

ہم کو زنجیر دکھائی نہیں دیتی لیکن
سب گراں بارو گرفتار چلے جاتے ہیں

بیٹھے رہتے ہیں کُھلے میں کئی پہروں آزر
دھوپ چبھتی ہے تو اُس پار چلے جاتے ہیں

O

لوگ بھی کیسے خرابوں میں اُتر جاتے ہیں
آنکھ میں اشک میں خوابوں میں اُتر جاتے ہیں

پیاس منظر پہ دھری رہتی ہے تا عمر یونہی
ہم بدن لے کے سرابوں میں اُتر جاتے ہیں

خود میں اُلجھائے ہُوئے رکھتے ہیں پھر تارِ دماغ
کچھ سوال اپنے جوابوں میں اُتر جاتے ہیں

روٹیاں پیٹ میں جا کر یہ گواہی دیں گی
ہاتھ کے ذائقے چھابوں میں اُتر جاتے ہیں

کام نمٹا لیے سب شام سے پہلے، ہم نے
اب فراغت کے نصابوں میں اُتر جاتے ہیں

دیکھنے والے اُترتے ہیں کسی منظر میں
سوچنے والے عذابوں میں اُتر جاتے ہیں

ایسے الفاظ سے آزار ہے عقیدت مجھ کو
جو خیالوں سے کتابوں میں اُتر جاتے ہیں

O

کیا نہیں کرنا ہے کیا تشہیر کرنا ہے مجھے
فیصلہ خود ہی دمِ تحریر کرنا ہے مجھے

باندھنا ہے برسرِ قرطاس سرسوں کا طلسم
لہلہاتے کھیت کو تصویر کرنا ہے مجھے

کب کسی عجلت کا ہونا چاہتا ہوں مَیں شکار
خود سے ملنے میں بہت تاخیر کرنا ہے مجھے

بننے سے پہلے جہاں معدوم ہو جاتے ہیں نقش
اس خرابے میں بھی کچھ تعمیر کرنا ہے مجھے

صرف اک ذرہ اٹھانا ہے سلگتی خاک سے
ساری دنیا کو کہاں زنجیر کرنا ہے مجھے

رنگ، اڑ جائیں گے شاخوں سے پرندوں کی طرح
اُس سے پہلے باغ کو تصویر کرنا ہے مجھے

آزر اک دن خواب سے اُس کو حقیقت میں کبھی
کھینچ کر لانا ہے اور تعبیر کرنا ہے مجھے

○

رنگوں کے پیچ و تاب میں تصویر الگ ہوئی
آنکھوں سے خواب، خواب سے تعبیر الگ ہوئی

آ کر لکیر کھینچ دی منظر میں وقت نے
صبحِ ازل سے شامِ ابد گیر الگ ہوئی

تجھ اِسم نے دماغ دیا خاکِ دہر کو
سو خاک آئینہ الگ اکسیر الگ ہوئی

رستے پہ حادثہ مجھے پیش آیا عشق میں
نقصان الگ ہُوا مرا تاخیر الگ ہُوئی

اُس نے ہوائیں ذائقہ تبدیل کر دیا
یوں شہد اُور شراب کی تاثیر الگ ہُوئی

وحشی کو شوق کھینچ کے لے آیا دشت میں
جیسے ہی اُس کے پاؤں سے زنجیر الگ ہُوئی

گرہیں تمام کھل سکیں آزر بہ قدرِ شوق
قرآں الگ لکھا گیا تفسیر الگ ہُوئی

O

گل کوئی چیز ہے نہ گِل کوئی چیز
خود سے بڑھ کر نہیں سجل کوئی چیز

آج کل سائے کے علاوہ بھی
پیچھا کرتی ہے مستقل کوئی چیز

سانس کھینچوں تو ایسا لگتا ہے
ہے کسی چیز میں مخل کوئی چیز

کون سمجھا سکا ہے دنیا کو
جاں کوئی جنس ہے نہ دل کوئی چیز

اشک کا ذائقہ بدلتی رہی
میری آنکھوں سے متّصل کوئی چیز

زخم تو جوں کا توں ہے سینے پر
ہو رہی ہو گی مندمل کوئی چیز

میری آنکھوں میں منتشر کوئی خواب
میرے سینے میں مشتعل کوئی چیز

ہے کوئی بات پُر اثر آزر
ہے کوئی چیز معتدل کوئی چیز

O

پنجاب کا موسم داخل ہوگا منظر کی شریانوں میں
سرسوں کے جب پھول کھلیں گے سندھ کے ریگستانوں میں

پیٹ کو بھرنے سے پہلے ہی نیت بھر کر شکر کیا
اُس کے ہاتھوں کی خوشبو موجود نہیں تھی کھانوں میں

میلے کچیلے ہاتھوں سے، ہم دوسری تہہ تک پہنچیں گے
نور سے مشتق ایک طہارت ہے تسبیح کے دانوں میں

ہونٹوں سے کچھ شبد گرے اُور گر کر چکنا چور ہُوئے
خاموشی بھرپور اذیت بن کر گونجی کانوں میں

ہم نقشے تک پہنچیں گے جب نقشہ دیمک چاٹ چکی
اُور خزانہ رکھا ہی رہ جائے گا تہ خانوں میں

اب کی بار بھی فصلیں اپنی نذرِ شعلہء رحمت ہیں
آسمان پہ بادل گرجا آگ لگی کھلیانوں میں

سچ لکھو تو یاد رہو گے ورنہ یاد رہے آزر
یاد نہ ہُونے کی اک خوبھی ہُوتی ہے افسانوں میں

O

• جو بھی ہُوا دُرست ہے ایسا بھی کیا غلط کیا
ناخُن سے مَیں نے وقت کے چہرے پہ دست خط کیا

آب و ہَوائے دہر نے باندھا طلسم بے طرح
رنگوں میں جان ڈال دی پھولوں کو بے نمط کیا

دستِ فسوں سرشت نے موئے قلَم سے خاک پر
مٹتی ہُوئی لکیر کو کھینچا اور اُس کو خط کیا

لکھنے سے پہلے گُفت گو لازم ہے اپنے آپ سے
ہم نے زبان کاٹ کر خامے کو زیرِ قط کیا

سب کو شناخت اُس نے دی پہچان کے لئے یہاں
سبزے میں رنگ بھر دیے مٹی کو خال و خط کیا

حرفِ سُخن تمام ہے اب خامشی مُدام ہے
جذبے کو عمر سونپ دی لفظوں کو بے نقط کیا

آزر ہر ایک لفظ کو ترتیب دی خیال میں
مجھ کو یہی دماغ تھا میں نے یہی فقط کیا

O

بے کار بیٹھنے سے تو بہتر ہے یوں نہ ہو
خلقت اگر برا بھی کہے عشق کیوں نہ ہو

اِک عمر یوں ہی مصرعِ ثانی پڑا رہے
مَیں بار بار مصرعِ اولیٰ کہوں نہ ہو

لفظوں کے ہیر پھیر سے بنتی نہیں ہے بات
جب تک سخن میں لذتِ سوزِ دروں نہ ہو

اب وصل پر بھی ہجر کا سایہ پڑا رہے
پہلو میں اپنے یار ہو اُس کا فسوں نہ ہو

جتنا میں اپنے ہونے سے نالاں رہوں، رہوں
جتنا تو مجھ سے کہتا رہے مَیں بھی ہوں نہ ہو

ہُونا ہے جو وہ ہو کے ہی رہنا ہے بات ختم
ہم لوگ لاکھ کہتے رہیں یوں ہو یوں نہ ہو

آ زر وہ آئے پُرسشِ احوال کے لیے
مجھ سے بیانِ حالتِ حالِ زبوں نہ ہو

○

گُذرا ہے کوئی عہد قرینے سے ہمارا
یہ زخم کُھلا وقت کے سینے سے ہمارا

ہم شام کی دہلیز پہ بیٹھے ہیں ابھی تک
اِک قافلہ نکلا تھا مدینے سے ہمارا

اک لہر یہاں آتی ہے نیندوں کے سفر پر
اُور خواب اُترتا ہے سفینے سے ہمارا

نقشہ یونہی صندوق سے نکلا نہیں اپنے
کچھ خاص تعلق ہے خزینے سے ہمارا

ہم لوگ جو گُم گشتہء تاریخ ہیں اک روز
پائیں گے سُراغ آپ دفینے سے ہمارا

کیا جانیے کس بات کا دھڑکا ہے نیا سال
دل ڈوب رہا پہلے مہینے سے ہمارا

سوچا ہے کہ دریافت کریں گے نئی دنیا
جی اُوبھ گیا قصد میں جینے سے ہمارا

اب تیرے سہارے کی ضرورت نہیں آزرؔ
اب پاؤں پھسلتا نہیں زینے سے ہمارا

○

جس احتیاط سے مصرع رفو کیا گیا ہے
میاں! یہ شعر نہیں دل لہو کیا گیا ہے

صلیبِ وقت پہ لٹکا دیا گیا ہے مجھے
جو چاہتا تھا وہی ہو بہو کیا گیا ہے

رہے یہ تشنگی تا حشر قائم و دائم
بلا کی پیاس میں ترکِ سبو کیا گیا ہے

تجھے اُٹھا کے فلک پر بٹھا دیا کس نے
مجھے رہینِ درِ آرزو کیا گیا ہے

یہ خواب ہے میں جسے جاگتے ہوئے دیکھوں
یہ آئینہ جو مرے چار سو کیا گیا ہے

وہ ایک اسم جو لوحِ ازل پہ لکھا گیا
وہ دل پہ نقش ہے اور ہو بہو کیا گیا ہے

سکوت ٹوٹنے والا کبھی نہیں آزر
یہ اختیارِ دمِ گفتگو کیا گیا ہے

○

ہَوائے دل پہ اگر آپ کو یقیں آتا
گُلِ سپید سرِ شاخِ یاسمیں آتا

فضا جو رخ نہ بدلتی گھنی اُداسی کا
غبار ہُوتا ہُوا کارواں یہیں آتا

کمال یہ ہے مجھے دیکھتی ہیں وہ آنکھیں
ملال یہ ہے اُنہیں دیکھنا نہیں آتا

مہکتی وصل کی خوشبو سے رہگذارِ حیات
کسی کا ساتھ مُیسر کہیں کہیں آتا

ہم اپنی آنکھ ٹکاتے جدید گنبد پر
ہمارے پاؤں تلے فرشِ مرمریں آتا

جب اپنی اوک میں بھر لیتے پیاس منظر کی
کہیں سے بہتا ہُوا آبِ تیلمیں آتا

فسوں کا کوئی تعلق نہیں فسانے سے
کہانیوں پہ ہمیں کس لیے یقیں آتا

مَیں جس کی چاہ میں کاغذ سیاہ کرتا ہُوں
وہ لفظ برسرِ امکان کیوں نہیں آتا

سجے ہُوئے اُسے ملتے یہ سقف و بام آزر
مکانِ دل میں اگر وقت پر مکیں آتا

O

جل کے سب کچھ ہُوا دھواں مجھ میں
آگ ہی آگ تھی رواں مجھ میں

اپنی تعظیم لازمی ہے مجھے
دفن ہیں میرے رفتگاں مجھ میں

کیا کروں اور کس طرف جاؤں
مجھ کو ملتی نہیں اماں مجھ میں

جھانک کر دیکھتا نہیں کوئی
پھول کھلتے ہیں رائگاں مجھ میں

دیکھ لیتا نگاہ بھر اُس کو
اِس قدر تاب ہی کہاں مجھ میں

قرب کے ذکر سے بھی بعض اوقات
پھیل جاتی ہیں دوریاں مجھ میں

خامشی بین کرنے لگتی ہے
گونجتا ہے مرا مکاں مجھ میں

کوئی بھی مجھ کو پا نہیں سکتا
گم ہے اِک ذات کا نشاں مجھ میں

کس کے قدموں کی چاپ ہے آزر
کون پھرتا ہے بے اماں مجھ میں

O

نیند میں کُھلتے ہُوئے خواب کی عُریانی پر
مَیں نے بوسہ دیا مہتاب کی پیشانی پر

اِس قبیلے میں کوئی عشق سے واقف ہی نہیں
لوگ ہنستے ہیں مری چاک گریبانی پر

نظر آتی ہے تجھ ایسوں کو شباہت اپنی
مَیں نے تصویر بنائی تھی کبھی پانی پر

ہم فقیروں کو اسی خاک سے نسبت ہے بہت
ہم نہ بیٹھے گے کبھی تختِ سُلیمانی پر

اس سے کچھ خاص تعلق بھی نہیں ہے اپنا
مَیں پریشان ہُوا جس کی پریشانی پر

آنکھ میں اشک کو اک رنگ دیا ہے خوں نے
اَور مجبور کیا وقت کو حیرانی پر

پاس ہے لفظ کی حُرمت کا وگرنہ آزر
کوئی تمغہ تو نہیں ملتا غزل خوانی پر

O

بنا رہا ہے وہ نقش اپنے ہُنر جو ہے شکل ساز اُس کا
وہ سب میں رہ کر بھی مختلف ہے یہی ہے اک امتیاز اُس کا

ملا تھا مجھ سے جو آسماں کے دبیز پردے کی چھاونی میں
دکھا دیا سب کو اُس کا چہرہ بتا دیا سب کو راز اُس کا

چمک رہا ہے وہ حُسن دل میں ہر ایک رخ سے ہر اک ادا سے
دمک رہا ہے مری نظر میں ازل سے ہی عکس ناز اُس کا

کُھلا ہے کیسا عجیب منظر اُٹھایا جانے لگا ہے لنگر
جزیرہء دل سے بحرِ جاں میں اُتر رہا ہے جہاز اُس کا

ہم اپنے سینے میں درد لے کر بھٹک رہے ہیں نہ جانے کب سے
کدھر گئے حضرتِ مسیحا کہاں گیا شاہ باز اُس کا

مَیں زینہ زینہ گذر رہا ہُوں خود اپنے دل سے خود اپنی جاں سے
سمجھ میں آنے لگا ہے کچھ کچھ خمِ نشیب و فراز اُس کا

نمو سے لبریز حرف جس کے تمام جذبے ہُوں صرف جس کے
نظر نہیں بے خُمار اُس کی سخن نہیں بے جواز اُس کا

عطائے خاص اُس پہ کیوں نہ ہُوتی جسے یقیں ہے احد پہ آزر
وہ اِس لیے معتبر ہے سب میں خدا ہے بندہ نواز اُس کا

O

رات کے سب مسافر پریشان ہیں آخرش ہم پکارے، کہاں جائیں گے
کس طرف جائے گی چاند کی روشنی صبحِ دم یہ ستارے کہاں جائیں گے

کس کو معلوم ہیں راہ کے پیچ و خم تم سمندر میں ہو اور ساحل پہ ہم
تم کہاں جاؤ گے زورقِ موج پر، ہم کنارے کنارے کہاں جائیں گے

شہر ویران ہو جائیں گا ایک دن باغ تبدیل ہو جائیں گے دشت میں
دیکھیے رنگ اڑتے ہوئے پھول کا سوچیے یہ نظارے کہاں جائیں گے

ہجر جاری رہا گر سرِ دشتِ ھوا اشک در اشک آنکھوں میں ہُو گا لہو
حد سے بڑھ جائے گا جب غمِ زندگی چڑھتے دریا اُتارے کہاں جائیں گے

چاند کے سامنے چاند آ جائے تو دفعتاً ایک حیرت میں ڈھل جائے گا
آئنہ دیکھ لے گر وہ آئنہ رو خال و خد اب سنوارے کہاں جائیں گے

بھید کھُل جائے گا خود ہی الفاظ کا ہے قرینہ یہ آزرؔ تگ و تاز کا
خواب ہو جائیں گی سب علاماتِ دل عشق میں استعارے کہاں جائیں گے

O

نفیِ احساس تھا اِثبات کہاں تک جاتا
لے کے تُو لب پہ سوالات کہاں تک جاتا

صبح تک آنکھ میں آیا ہے نکل کر دل سے
جانے یہ خوابِ طلسمات کہاں تک جاتا

دیکھتا ہُوں مَیں اُسے خود سے جُدا ہُوتے ہُوئے
سوچتا ہُوں وہ مرے ساتھ کہاں تک جاتا

مختصر یہ کہ مَیں بوسہ بھی غنیمت سمجھا
یوں ہی دورانِ ملاقات کہاں تک جاتا

یہ ہیولہ جو رکا ہے تری دنیا بن کر
یہ پسِ ارض وسماوات کہاں تک جاتا

اولیں دن کا بھی احوال بتایا ہم کو
صاحبِ کشف وکرامات کہاں تک جاتا

اس نے کاندھوں سے شب وروز جھٹک ڈالے ہیں
بوجھ اُٹھائے ہُوئے دن رات کہاں تک جاتا

مل گیا مجھ کو بھی اک آئنہ خانے کا سُراغ
ہُو گئی خود سے ملاقات کہاں تک جاتا

چاند تارے تو مرے بس میں نہیں ہیں آزر
پھول لایا ہُوں مرا ہاتھ کہاں تک جاتا

O

کیا نیا تماشا ہے آئینے کے پانی میں
موج ہے نہ چہرہ ہے آئینے کے پانی میں

ایک خواب آنکھوں کی خشک سرزمینوں پر
ایک خواب رکھا ہے آئینے کے پانی میں

رنگ آنے والے ہیں شاخِ نودمیدہ پر
پھول کھلنے والا ہے آئینے کے پانی میں

وہ بھی اِس کنارے پر خیمہ زن ہیں مدت سے
جن کو ڈوب جانا ہے آئینے کے پانی میں

خال و خد کی لہروں میں بہہ گئی مری صورت
عکس ہے کہ دھوکا ہے آئینے کے پانی میں

سب کے سب تماشائی جانتے ہیں پہلے سے
کون ڈوب سکتا ہے آئینے کے پانی میں

بوند بوند حکمت سے حُسن کے نشانوں کی
بھیگتا سراپا ہے آئینے کے پانی میں

خواہشوں کو ملتے ہیں خال و خد یہاں آزرؔ
جانے اَور کیا کیا ہے آئینے کے پانی میں

O

ہونے تھے ہو رہے ہیں خسارے مرے بہت
گردش میں آج کل ہیں ستارے مرے بہت

کل آئنے کے کان میں اُس شوخ نے کہا
ملتے ہیں نین نقش تمہارے مرے بہت

محسوس ہو رہا ہے کہ وسعت پذیر ہوں
کچھ دن سے جھڑ رہے ہیں کنارے مرے بہت

میں جانتا ہوں لوٹ کے آنا نہیں تجھے
اے وقت مجھ کو جان سے پیارے مرے بہت

ہوتے مرے کسی کو نہیں تھا مرا خیال
میں چل پڑا تو خواب پکارے مرے بہت

پہلے تو چاک پر مری مٹی پڑی رہی
پھر کوزہ گر نے نقش نکھارے مرے بہت

آزرؔ کیا اسی لیے ہمزاد سے گریز
وہ بھانپنے لگا تھا اشارے مرے بہت

○

تغیرات کے مارے جگہ بدلتے ہیں
تمام رات ستارے جگہ بدلتے ہیں

ڈھلک ڈھلک کے اُترتی ہے خاک دریا میں
چھلک چھلک کے کنارے جگہ بدلتے ہیں

نکلنے والے نکل آئے اپنے دائرے سے
بدلنے والے سیارے جگہ بدلتے ہیں

مری شباہتیں آئیں گی میرے بچوں میں
کہ خد و خال ہمارے جگہ بدلتے ہیں

درونِ خواب فسونِ گل و گیاہ نہ پوچھ
قدم قدم پہ نظارے جگہ بدلتے ہیں

زمین گھومتی رہتی ہے آسمانوں کے گرد
اور آسمان بھی سارے جگہ بدلتے ہیں

ہم ایک لحظہ بھی پاتے نہیں سکوں آزرؔ
اگرچہ وقت کے دھارے جگہ بدلتے ہیں

○

وقت نے مجھ بدن کو آ لیا ہے
ڈھلتا سورج مرا مثالیہ ہے

اِس سے بڑھ کر شکست کیا ہو گی
آئینے سے فریب کھا لیا ہے

مَیں نے اِک رات کی رعائت سے
اپنی مرضی کا دِن بنا لیا ہے

جسم پہنا ہے پیرہن کی طرح
کام چلتا نہ تھا چلا لیا ہے

مَیں ہی وہ بد دماغ ہوں جس کا
سارا لکھا ہُوا سوالیہ ہے

پہلے آنسو بنایا زخموں کو
بعد میں شاعری بنالیا ہے

جسم کی کارگاہ میں رہ کر
روح کا بھید کس نے پالیا ہے

کیا عجب واقعہ ہے ڈوبنے سے
اِک ندی نے ہمیں بچالیا ہے

اب کوئی فائدہ نہیں آزرؔ
اب تو شاخوں نے بور اُٹھالیا ہے

O

اُس پھول سے دو چار کہیں تُم ہو کہیں مَیں
خوشبو کے گرفتار کہیں تُم ہو کہیں مَیں

عجلت میں ہمیں وقت نے تعمیر کیا تھا
گرتی ہُوئی دیوار کہیں تُم ہو کہیں مَیں

مشہور ہے اِس گاؤں میں یارانہ ہمارا
اور یارِ طرحدار کہیں تُم ہو کہیں مَیں

آباد کناروں پہ قبائل ہیں ہمارے
دریا کے طرف دار کہیں تم ہو کہیں مَیں

ہر عکس دمکتا ہے سرِ آئنہ خانہ
منظر سے نمودار کہیں تم ہو کہیں مَیں

تحلیل کی خو خاک میں رکھی تھی احد نے
مٹتے ہُوئے آثار کہیں تُم ہو کہیں مَیں

اس دشتِ حوادث کی کڑی دھوپ میں آزر
بے یار و مددگار کہیں تُم ہو کہیں مَیں

O

دشت بے آب ہے یاں پھول نہیں کھل سکتے
ہیں مُصر دل زدگاں پھول نہیں کھل سکتے

موسمِ گل تری صحبت کا اثر ہے دل پر
زخم کھلتے ہیں یہاں پھول نہیں کھل سکتے

تُو نہ ہو تو ترے ہونے کا گُماں رہتا ہے
خواب ہوتے ہیں جہاں پھول نہیں کھل سکتے

اِک ترا ساتھ ترا قرب ملے پل بھر کو
یار کھلنے کو کہاں پھول نہیں کھل سکتے

رت بدلنے میں ذرا دیر ہے پھر دیکھیے گا
کیا کہا ہم نفساں پھول نہیں کھل سکتے

زرد پڑتے ہوئے گلزار فلک آزردہ
ہے زمیں نوحہ کناں پھول نہیں کھل سکتے

مَیں بناتا ہوں جہاں قوس نہیں بن پاتی
مَیں کھلاتا ہوں جہاں پھول نہیں کھل سکتے

آ ذرا آ جائے گا رنگ ان کا تری آنکھوں میں
اِس قدر دِل میں نہاں پھول نہیں کھل سکتے

O

نیند میں خواب کُھلے خواب میں ہو نیل پَری
اچھی لگتی ہے مجھے کیفیتِ بے خبَری

پھر وہی تو وہ ترا شہر ترے شہر کے لوگ
پھر وہی میں مرا کاسہ مری دریوزہ گری

ایک کونے میں بچھایا ہُوا اُس شاہ کا تخت
کسی دربار کی مانند سجی بارہ دری

ایک منظر کو بنانے میں ہوئی عمر تمام
خوب احساسِ زیاں ہے یہ مری کم ہنری

ورنہ میرے لیے بے تاب کہاں تھا کوئی
مجھے اپنی ہی تگ و دو سے ملی خوش خبری

مرے عیسٰی ترا مصرف ہی بھلا کیا ہوگا
وقت پر کام نہ آئی جو تری چارہ گری

آج تک خود میں کمی ڈھونڈ رہا تھا آزرؔ
آئنہ دیکھ کے یاد آئی تری دیدہ وری

○

مَیں اکیلا تھا زمیں پر کہکشاں تک لے گیا
آسمانی شخص آیا آسماں تک لے گیا

جس بھنور سے کھیلتا تھا میں کنارے پر یونہی
موج میں آیا تو مجھ کو درمیاں تک لے گیا

تم ابھی اس ہجر کو پہچان ہی پائے نہیں
یہ مری اِک اِک بہار اِک اِک خزاں تک لے گیا

وہ حقیقت تھی کوئی نہ خواب کا آغاز تھا
تو مجھے ہمراہ جانے کس جہاں تک لے گیا

کس نے دن کے طاقچے کو رنگ بخشا سرمئی
کون صحرا کو سنہرے سائباں تک لے گیا

اُس کے اندازِ بیاں نے سحر طاری کر دیا
کھینچ کر وہ مجھ کو اپنی داستاں تک لے گیا

جانے ہو کس موڑ پر آزر مآلِ جستجو
جاؤں گا شوقِ سفر مجھ کو جہاں تک لے گیا

O

دن نکلتے ہی درختوں کا ہدف دھوپ ہوئی
اک طرف سایہ ہوا ایک طرف دھوپ ہوئی

سوچتے سوچتے آیا شب امکاں پہ یہ رنگ
دیکھتے دیکھتے دیوار سے لف دھوپ ہوئی

میں نے قرطاس پہ اس کو بھی کیا ہے تصویر
قبل از شام جو منظر سے حذف دھوپ ہوئی

روشنی کرنے کی سورج سے لگائی تھی شرط
میں چراغوں میں جلا اس کا شغف دھوپ ہوئی

صاف و شفاف مناظر ہیں جہاں تک دیکھو
آئنہ ہوتی ہوئی چاروں طرف دھوپ ہوئی

در بدر گھومتی پھرتی ہے کوئی پرچھائیں
ڈر کو اسباب ملا رات خلف دھوپ ہوئی

سارے ذرات چمکتے ہیں سر دشت بدن
اندرون چشم کھلی مہر بہ کف دھوپ ہوئی

پوچھنے والا کوئی ہو تو بتائیں آزر
کس طرف چاند گیا کون طرف دھوپ ہوئی

O

دیکھتے دیکھتے اِک منظر جب آنکھوں میں معدوم ہُوا
حُسن ہے کیا یہ جانا ہم نے رنگ ہے کیا معلوم ہُوا

لفظ اکٹھے کر لینے سے بات نہیں بنتی لیکن
کاغذ پر تصویر ہے سب کچھ جس سے جو منظوم ہُوا

تاریکی اور نُور میں کتنا فرق ہے کس سے پوچھا جائے
صبح کا معنیٰ کیا نکلے گا رات کا کیا مفہوم ہُوا

باقی سب کچھ بے معنی ہے بے مصرف ہے لا یعنی ہے
علم وہی ہے اِس دنیا میں جس کو جو معلوم ہُوا

عشق میں یہ تہہ داری کیوں کر اپنی سمجھ سے باہر تھی
ہجر سے جاں سیراب ہُوئی جب وصل سے دِل محروم ہُوا

رات کی گدلی تاریکی میں منظر کتنا روشن ہے
اِک چڑیا کو تنہا پا کر اِک جگنو مغموم ہُوا

پہنچ نہیں پائے ہیں آزر آج بھی ہم اُس مرکز تک
خاک جہاں تجسیم ہُوئی تھی وقت جہاں مقسوم ہُوا

O

سو بڑھ کے ختم ہُوا تھا نہ گھٹ کے ختم ہُوا
اندھیرا اپنے مقابل ہی ڈٹ کے ختم ہُوا

اُسی کا زہر رگ و پے میں دوڑتا ہے مری
وہ آبلہ جو مرے دل میں پھٹ کے ختم ہُوا

ٹھہر کے خواب میں منظر کی وسعتیں دیکھی
اُتر کے آنکھ میں دریا سمٹ کے ختم ہُوا

مگر وہ شب جو بکھر کر نہ ہو سکی معدوم
مگر وہ چاند جو ٹکڑوں میں بٹ کے ختم ہُوا

عجیب لہر اُٹھی تھی فراتِ ہستی سے
تماشا جس کا سفینہ اُلٹ کے ختم ہُوا

کسی بھی ہاتھ پہ اُس کے نشاں نہیں ملتے
وہ رنگِ سُرخ جو منظر سے ہٹ کے ختم ہُوا

سوائے شکر کے ہونٹوں پہ کچھ نہیں آزرؔ
مَیں اپنے دشمن جاں سے نمٹ کے ختم ہُوا

O

مجھ کو کیا کیا گماں یقیں پر تھا
رات بھر خواب کی زمیں پر تھا

دھند چھٹتی تو کچھ نظر آتا
ابر سا چشمِ سرمگیں پر تھا

پاؤں کے نیچے تھی زمین ابھی
آسماں بھی یہیں کہیں پر تھا

سب ستاروں کی مانگ خالی تھی
داغ مہتاب کی جبیں پر تھا

خاک گلزار ہونے والی تھی
نخل اک آبِ نیلمیں پر تھا

اس نے چہرے سے جب اٹھایا نقاب
میں وہاں تھا نہیں، نہیں پر تھا

کوئی دشمن نہیں بچا تھا مگر
ایک سایہ مری کمیں پر تھا

سارے منظر ہیں دیکھے بھالے ہوئے
گویا پہلے بھی میں یہیں پر تھا

آنکھ فانوس پر لگی ہوئی تھی
اور قدم فرشِ مرمریں پر تھا

سانپ پالا نہ تھا ابھی لیکن
شک مجھے اپنی آستیں پر تھا

میں بھی اس رات تھا وہیں آزرؔ
میرا ہمزاد بھی وہیں پر تھا

○

قوسِ قزح کے رنگ مری تصویر میں لانے والی ہے
منظر منظر آنکھ نہ جانے کیا دہرانے والی ہے

عمر گذاری منتظری میں تب جا کر معلوم ہُوا
وصل کی ساعت ہجر سے بڑھ کر جی لرزانے والی ہے

سُن کر اِن سنگیت بھرے جھرنوں کی بہتی آوازیں
میرے اندر کی خاموشی باہر آنے والی ہے

کون سنبھالے یاد کسی کے وصل میں گذرے موسم کی
بیتے دِنوں کی راکھ ہی دل میں خاک اُڑانے والی ہے

مَیں تو ازل سے بیٹھا ہوں سورج کی طرف چہرہ کر کے
وہ کیسے درویش ہیں جن کو دھوپ جلانے والی ہے

جن لہروں کو دیکھ رہا ہوں آزرؔ مَیں حیرانی سے
اِن لہروں کو دیکھ کے مجھ کو نیند بھی آنے والی ہے

○

وہ علاقہ دل ہے! جس میں سب مکینوں کے لیے
ایک جیسے گھر بنیں گے کچھ مہینوں کے لیے

شُکر کا سجدہ ادائی چاہتا ہے وقت پر
آستاں کا سنگ روشن ہے جبینوں کے لیے

جانے کن الفاظ کا جادو ہُنر کہلائے گا
جانے کس احساس کی رو ہے نگینوں کے لیے

خُون مہکایا گیا تھا زرد ہونٹوں کے سبب
آگ دِہکائی گئی ہے سرد سینوں کے لیے

اصطبَل خالی ہُوا تو شاہ نے تلقین کی
اَسپ ہُونے چاہئیں نایاب زینوں کے لیے

دوست دیکھے جا رہے ہیں تا کہ تنہائی مٹے
سانپ ڈھونڈے جا رہے ہیں آستینوں کے لیے

سیر کرنا اِن کو آزرؔ اِس قدر آساں نہیں
آسماں ہُونا پڑے گا اِن زمینوں کے لیے

O

ہَوا کے رخ پہ کنارہ نہیں بنانا مجھے
جو بن چکا ہے دوبارہ نہیں بنانا مجھے

کوئی بھی خواب نہیں لانا مجھ کو کاغذ پر
کہیں بھی نقش تمہارا نہیں بنانا مجھے

خجل ہُوا ہُوں مَیں اِس کائنات میں کیا کیا
بنانے والے دوبارہ نہیں بنانا مجھے

مَیں روح پھونکنے آیا ہُوں خشک مٹی میں
روا روی میں یہ گارا نہیں بنانا مجھے

مجھے بنانا ہے اِک رنگ سات رنگوں سے
مگر برائے نظارا نہیں بنانا مجھے

تو پھر مَیں کون سا منظر بنانے آیا ہُوں
جو لفظ اشارہ نہیں بنانا مجھے

اُڑا کے خاک بنانا ہے آسماں آزر
اور اس پہ کوئی ستارہ نہیں بنانا مجھے

O

کسی کے دھیان کی لَو سے لِپٹ کے آگئی ہے
ہماری آنکھ میں دنیا سمٹ کے آگئی ہے

کہا بھی تھا کہ فضا سازگار ہونے دو
پتنگ صحنِ تمنا میں کٹ کے آگئی ہے

جو آفتاب میں رکھی تھی دستِ قدرت نے
وہ روشنی بھی چراغوں میں بٹ کے آگئی ہے

تمام لفظ ملیں گے گذشتہ معنوں سے
ہَوا کتاب کے اوراق اُلٹ کے آگئی ہے

تمہارے ہجر کا موسم ابھی نہیں گذرا
مگر یہ لہر اُداسی سے ہَٹ کے آگئی ہے

نفس کی آمد و شُد خوش گوار کیسے ہو
حیات راہ کی مٹی سے اَٹ کے آگئی ہے

تو کیا ملے گی ہمیں مہلتِ سکوں آزر
تو کیا وہ ساعتِ خوش رو پلَٹ کے آگئی ہے

○

کس طرح پہنچیں وہاں تک سوچ کر بے تاب ہیں
سندھ میں سرسوں کھلی ہے اور ہم پنجاب ہیں

جاگ کر اِن منظروں کی وقت پر تصویر کھینچ
یہ کھلی آنکھوں سے دیکھے جانے والے خواب ہیں

آؤ مل کر اک نیا طوفان اُٹھائیں بحر سے
تم سرِ آبِ رواں ہو ہم پسِ گرداب ہیں

تیری خوشبو سونگھنے کو پھول ہیں ترسے ہُوئے
تیری صورت دیکھنے کو آئینے بے تاب ہیں

درد مت جانو اِسے یہ دین ہے احباب کی
اشک مت سمجھو اِنہیں یہ گوہرِ نایاب ہیں

حضرتِ انسان سے لے کر خدائے حرف تک
سب محبت کے ہمیں بخشے ہُوئے القاب ہیں

ہو نہ ہو آزرؔ اسے گوندھا گیا تیزاب میں
جسم کے سب ذائقے تاثیر میں سیماب ہیں

O

صحرا کی اشتہا نہ سمندر کے خوف سے
ترکیب پا رہا ہُوں مَیں اندر کے خوف سے

چندھیا گئی ہے روشنی آنکھوں میں ڈوب کر
دھندلا گیا ہے آئنہ منظر کے خوف سے

سائے میں جسم ڈھل گئے آسیب جل گئے
اندر کا خوف مر گیا باہر کے خوف سے

رنگوں کا جال بچھ گیا پھولوں کی لاش پر
تتلی کی نیند اُڑ گئی بستر کے خوف سے

پامال ہو رہا ہے ہواؤں کا قافلہ
خوشبو رکی ہوئی ہے گلِ تر کے خوف سے

اے دوست اب کے مدِ مقابل کوئی نہیں
کمزور پڑ گیا ہوں برابر کے خوف سے

اُس کے لیے تو خودکشی آزرؔ حلال ہو
کچھ بھی نہ کر سکے جو مقدر کے خوف سے

O

لگن کی شاہ راہ سے بدن کی کارگاہ تک
تڑخ چکے ہیں آئینے چٹخ چکی نگاہ تک

دمک رہا ہے خاکداں دھڑک رہا ہے آسماں
چمک رہے ہیں جسم و جاں سپیدی و سیاہ تک

بیاں ہو کیسے شرحِ غم کہاں سے بات ہو شروع
کہاں پہ کھیل ختم ہو، ابد کی خانقاہ تک

مٹے ہوئے ہیں نقشِ پا عدم کی رہگذار ہے
نظر نظر غبار ہے پس اُن کی بارگاہ تک

نگاہ بینت کے رکھو قدم اُٹھاؤ دھیان سے
سفر طویل ہے مگر چلیں گے مہر و ماہ تک

وہ لفظ تھا کہ اسم تھا وہ لمس تھا کہ جسم تھا
عجیب سا طلسم تھا نظارہ و نگاہ تک

سفید پھول کِھل اُٹھے لہو کا نم لیے ہوئے
فصیل شہرِ خواب سے دیارِ کج کلاہ تک

O

یہ اِک فقیر کا حجرہ ہے آ کے چلتے بنو
پڑی ہے طاق پہ دنیا اُٹھا کے چلتے بنو

جہانِ فانی ہے مت سوچنا سکونت کا
بس اپنے نام کا سکہ بٹھا کے چلتے بنو

اب اِس کے بعد شکاری کمان کھینچے گا
تم اُس سے پہلے ذرا پھڑپھڑا کے چلتے بنو

ہے بھیڑ ساقیء کوثر کو دیکھنے کے لیے
سب اپنی پیاس بجھاؤ بجھا کے چلتے بنو

نہیں ہے فائدہ اب کوئی سینہ کوبی کا
بہانے آئے تھے جو خوں بہا کے چلتے بنو

ہُوا ہُوں تلخ تو باعث بھی لازمی ہے کوئی
مَیں تم سے اِس لیے روٹھا ہُوں تاکہ چلتے بنو

سجی رہے گی یونہی بزمِ حشر تک آزر
تُم اپنے شعر سُناؤ سُنا کے چلتے بنو

لیاقت جعفری

ڈاکٹر محمد سلیم

ثمر فرحت

"دلاور علی آزر کی شاعری سے گزرتے ہوئے جدید اُردو غزل پر میرا ایمان مزید پختہ ہوگیا ہے۔ شعر کہتے تو بہت سے اور بھی ہیں مگر شعر کو شعر بنانا کسی کسی کو ہی آتا ہے۔ یہ شاعر مجھے چند ہی دوسروں کے ساتھ اگلی صف میں کھڑا دکھائی دیتا ہے، اس کی اُٹھان سے پتا چلتا ہے اس کا لہجہ اسقام سے پاک اور خود اعتمادی کا جذبہ حیران کُن ہے۔ یہ غزلیں تازگی اور تاثیر کا ایک ایسا جھونکا ہے جس نے اردگرد کی ساری فضا کو معطر کر دیا ہے اس شاعری نے مجھے مسرت سے ہمکنار کیا ہے۔ میری دُعائیں اس شاعر کے ساتھ ہیں۔ یہ اعلیٰ و عمدہ شاعری چھاپنے پر ادارہ تفہیم کو میری طرف سے دلی مبارک باد۔"

ظفر اقبال

پاکستان

"اس انتخاب میں شامل غزلیں واقعی بہت اہم ہیں ان میں شعریت بھی ہے تاثیر بھی اور تازہ کاری بھی مزہ دیتی ہے۔ دلاور علی آزر کی غزلوں میں ایسے اشعار بھی کثرت سے ملتے ہیں جن میں عصر حاضر کے شعر و ادب سے ذوق رکھنے والے قارئین کے لیے اس کا مطالعہ منفعت رہے گا۔ دلاور علی آزر نے غزل میں رمزیاتی اور ایمائی کیفیت سے دور ہوئے بغیر اپنے عہد کی سماجی بصیرت کو نہایت موثر شاعرانہ پیرائے میں پیش کیا ہے اُن کی غزلوں میں یہ بصیرت اور دردمندانہ احساس نمایاں نظر آتا ہے اس انتخاب کو شائع کرنے کے لیے میری طرف سے ادارہ تفہیم کو ڈھیروں مبارک باد۔"

شمیم حنفی

دہلی (انڈیا)

EDUCATIONAL
PUBLISHING HOUSE
www.ephbooks.com

978-93-86624-21-5